اب کیا کرنا چاہیے اے اقوامِ شرق

مثنوی پس چہ باید کرد کا منظوم اُردُو ترجمہ

مترجم

تحسین فراقی

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
حکومت پاکستان
قومی ورثہ وثقافت ڈویژن
چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 36314510, 99203573p
Fax: [+92-42] 36314496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-557-8

طبع اول	:	۲۰۲۱ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۵۶۰ روپے
مطبع	:	فرید یہ آرٹ پریس انٹرنیشنل، لاہور

محلِ فروخت--۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور-فون: 37357214

انتساب

پاکستان کے ممتاز دانشور اور ماہرِ دینیات

مرحوم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

(۱۹۰۵-۱۴ جولائی ۱۹۹۵ء)

کے نام

فہرستِ مطالب

☆ مقدمہ	ڈاکٹر تحسین فراقی	۷
۱) کتاب کے قاری سے		۲۹
۲) تمہید		۳۱
۳) مہر عالمتاب سے خطاب		۳۷
۴) کلیمی حکمت		۴۰
۵) حکمتِ فرعونی		۴۵
۶) لا الٰہ الّا اللّٰہ		۴۸
۷) فقر		۵۳
۸) مردِ حر		۶۳
۹) اسرارِ شریعت		۶۸

۱۰) ہندیوں کے نفاق پر چند آنسو ۷۵
۱۱) عہدِ حاضر کا نظامِ سیاست ۷۹
۱۲) اُمّتِ عربیہ سے چند باتیں ۸۵
۱۳) اب کیا کرنا چاہیے اے اقوامِ شرق ۹۱
۱۴) حضورِ رسالت مآبؐ میں ۱۰۱

مقدمہ

طوفے خود کن، گر دِ ایوانے مگرد

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑی شاعری ہی بڑی شاعری کے خصائص، معیارات اور شرائط کا تعین کرتی ہے مگر بڑی شاعری کے مطالبات بہت کڑے اور اس کی تخلیق خونِ جگر کھائے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ تخلیق کار بعض اوقات کسی متعین مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر شاعری کو اس مقصد کی ترسیل کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ اب اگر اس کا متخیّلہ کمزور اور زبان و بیان پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو تو شاعری محض ڈھنڈورچی کا اعلان بن کر اپنے مقامِ رفیع سے گر جاتی ہے۔ یوں گویا شاعری اپنی آزاد اور خود مختار حیثیت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور اس کی تاثیر کا دائرہ سکڑ جاتا ہے۔ ایسی شاعری کی حیثیت شعلۂ مستعجل کی ہوتی ہے۔ بس ایک لمحے کی بھڑک اور اس کے بعد ایک بے روح اور ناقابلِ التفات خاکستر! بڑی شاعری انسانی روح کی عمیق ترین آوازوں اور آرزوؤں کو محفوظ کرتی ہے۔ یہ ایک انتہا سے اگلی انتہا کا سفر سانس پھولے بغیر جاری رکھتی ہے تا آنکہ فکر و خیال کا ایک نامیاتی کل ظہور کرتا ہے، خیال اور الفاظ گھل مل کر ایک حیران کُن وحدت تشکیل دیتے ہیں اور پڑھنے والا تو کیا خود لکھنے والا ایک سرشاری کی کیفیت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ بڑا شاعر زبان کے ہاتھ میں ایک ہتھیار نہیں ہوتا۔ تلوار کی کاٹ سے کسے انکار ہے مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ: تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیے!

اقبال کا ظہور برِعظیم کی تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر ہوا جب صدیوں سے جاری مسلم حاکمیت اور سالمیت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور سات سمندر پار سے قوت اور برتری کے نشے میں چور ایک قوم نے اس سرزمین پر اپنے پنجے گاڑ لیے تھے۔ حادثہ یہ ہوا کہ معاشرے کی بچی کھچی خلّاق قوتوں نے بھی زیادہ تر استعمار کی غلامی کو ذہناً قبول کر لیا تھا۔ اقبال اس صورتِ حال میں ایک بڑا انقلاب لانے کے متمنی تھے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے آرزومند تھے جہاں

متخیّلہ مقید اور معتوب نہ ہو۔ صداقت اور خلاقیت کے بڑے سرچشموں سے فیض اندوزی نے ان کی شخصیت میں عرفانِ ذات، حریّتِ فکر، سربلندی اور جہانِ تازہ کی نمود کے شکست ناپذیر داعیے کی تخلیق کی اور اسی داعیے کے نتیجے میں اُردو اور فارسی شعر و ادب میں بالِ جبریل، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، گلشنِ راز جدید اور ''پس چہ باید کرد'' جیسے شعری معجزے ظہور میں آئے۔ مقصد نے شاعری کا گھٹنا نہیں دبایا اور نظریے نے شاعری کو پابہ زنجیر نہیں کیا۔ یہ سب اس وجہ سے ممکن ہوا کہ اقبال کو قدرت کی طرف سے بے مثال متخیّلہ ملا تھا اور اُنھوں نے مشرق کی فلسفیانہ، شعری اور تہذیبی روایت اور اس کے اسالیب کو بڑی حیران کن صورت میں اپنے وجود میں گھُلا ملا لیا تھا۔ کیا یہ ایک حیرت خیز معاملہ نہیں کہ مسلم ثقافت، مسلم نشاۃِ ثانیہ اور مسلم فضائل کو سربلند اور پورے آفاق میں پھیلا دینے کا متمنّی یہ شاعر اپنی شاعری کو نعرہ بننے سے کس خوبی سے بچا لے جاتا ہے اور اسے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کہیں بھی سپاٹ نہیں ہونے دیتا۔ یہیں آ کر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ مقصدی شاعری کو صرف ایک ہی شے نعرہ بننے سے بچاتی ہے اور وہ ہے زبان کا نہایت خلاقانہ استعمال اور یہ استعمال بہ ذاتِ خود ایک خلاق ذہن اور غیر معمولی لسانی شعور کا زائیدہ ہوتا ہے۔ اقبال کے پاس یہ دونوں ہتھیار تھے!

''پس چہ باید کرد'' اقبال کے ان شعری صحیفوں میں سے ایک ہے جس کے تار و پود میں مقصدیت رچی بسی ہے۔ وفات سے صرف دو برس پہلے لکھی جانے والی یہ کتاب اپنے مطالب اور مفاہیم کے اعتبار سے حد درجہ قابلِ توجہ ہے۔ اس کتاب کے ظہور میں آنے سے اٹھارہ، بیس برس قبل رموزِ بے خودی اور اسرارِ خودی منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ اقبال کا شاہکار جاوید نامہ اس کی آمد سے تین چار برس پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شعری کمالات کے حامل تین مجموعے پیام، زبور اور بالِ جبریل شائع ہو چکے ہیں۔ بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ اقبال اپنے تمام شعری امکانات، اعلیٰ نصب العین، عمرانی تصورات، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور نشاۃِ ثانیہ کے بھید بھاؤ بتا چکے ہیں اور اب ان کے پاس کوئی بات کہنے کو نہیں۔ مگر ایسا نہیں۔ جس باغبانِ ازلی نے ان کی مٹی میں مصرع بو کر شمشیر کی فصل کاٹی تھی اس نے انھیں سمجھایا کہ شجر کو نخلِ سینا بنانے کا عمل تادمِ آخر جاری رکھنا تمھارا مقدّر رہے۔ کل تریسٹھ برس کی قلیل زندگی مگر کتنی بابرکت اور بارآور رہی!

کل پانچ سو تیس شعروں پر مشتمل ''مثنوی پس چہ باید کرد'' کا مطالعہ قاری کے اندر گو کہ احساسِ نشاط بھی پیدا کرتا ہے مگر اس سے بڑھ کر احساسِ درد کی جوت جگاتا ہے۔ اس چھوٹی سی مثنوی میں اقبال نے کئی زمانوں کو نہایت ایجاز کے ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ اس میں ایجاز، اعجاز کی حدوں تک پہنچتا ہے۔ دو دو مصرعوں میں ایسے ایسے مضامین سمیٹ لپیٹ لیے ہیں کہ ان کی معجز بیانی پر حیرت ہوتی ہے۔ مثنوی کے کتنے ہی شعر اور مصرعے ہیں جو ضرب المثل بن کر آج بھی اہلِ علم کے نوکِ زبان ہیں:

خرقہ خود بار است بر دوش فقیر　　چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر

درسِ او اللہ بس باقی ہوس

کرگسی کم کن کہ شاہیں زادہ ای

مکر و فن ؟ تخریبِ جاں ، تعمیرِ تن

در مقامِ لا نیاساید حیات　　سوئے اِلّا می خرامد کائنات

تیغِ لا در کف نہ تو داری نہ من

دولتِ اغیار را رحمت شمرد　　رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

گورِ خود می کند از شمشیرِ خویش

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس　　　نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

ـــــــــ

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں　　　عید محکوماں ہجومِ مومنیں

ـــــــــ

اُمتے بودی امم گردیدہ ای[1]

ـــــــــ

مومنِ خود کافرِ افرنگ شو!

ـــــــــ

عصرِ حاضر زادۂ ایام تست

ـــــــــ

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

ـــــــــ

اقبال کو ایک نہایت مرتّب اور نکتہ آفریں ذہن ملا تھا۔ ''پس چہ باید کرد'' تک آتے آتے وہ اپنی فکر اور اپنے اسلوب کی جولانی بلکہ معراج پر تھے۔ فکرِ اقبال کے چند حاوی مضامین یعنی عشق، تخلیقِ آرزو، پیرِ رومی سے عقیدت و عشق، تہذیب مغرب کے خوفناک حد تک سلبی اور مشرق خراش پہلو، توحید اور اس کے ثمرات، حکمتِ قرآن، برکاتِ اسلام، مسلم تہذیب کی فیض رسانی، عظمتِ فقر، مردِ حُر کی آتش نفسی، اثباتِ ذات، عالمی سیاسیاتِ حاضرہ، مسلم نشاۃِ ثانیہ کی تڑپ اور زوال کے اندھیروں سے نکلنے کی تدابیر زیرِ نظر کتاب میں بھی بڑے سلیقے اور گہرے نظم کے ساتھ اور زبان و بیان کی لطافت، زورِ کلام اور ندرتِ اظہار کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں۔ اقبال کے سینے میں یہ خلش تمام عمر رہی کہ عالمی سطح پر ماضی کی فیض رساں مسلم ملت دوبارہ کیسے عروج حاصل کرسکتی ہے۔ یہ ایقان عمر بھر ان کے دل میں موجزن رہا کہ برسا ہوا بادل اپنے اندر اب بھی

---

[1] یہی بات رموزِ بیخودی میں بھی قبل ازیں کہی ہے:

صد ملل از ملتے انگیختی　　　بر حصارِ خود شبیخوں ریختی

برقِ بے زنہار کی گرمی اور تڑپ رکھتا ہے۔ اقبال کو مشرق اور ایشیا سے نہایت درجہ دلچسپی اور ایک عاشق کی سی وابستگی ہے۔ ''پیامِ مشرق'' (۱۹۲۳ء) کے تیرہ برس بعد ''پس چہ باید کرد [اے اقوامِ شرق]'' کا ظہور میں آنا محض اتفاق نہیں، اس کے پس پشت گہری وجوہات اور فکر خیز اسباب موجود ہیں۔ یہ بات اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ سرزمینِ مشرق ہی میں تمام مذاہبِ آسمانی کا ظہور ہوا۔ مذاہبِ سماوی اور خصوصاً دینِ اسلام سے اقبال کی وابستگی ظاہر و باہر ہے۔ دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا منظرنامہ بھی مشرق ہی کی سرزمین رہی ہے۔ اقبال جہاں تواتر سے مشرق کا ذکر کرتے ہیں وہیں ایشیا کا ذکر بھی متعدد مقامات پر کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا مشرق اور ایشیا کو وہ مترادفات کے طور پر برتتے ہیں۔ مشرق اور ایشیا کی عظمت کا احساس فکرِ اقبال میں مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایشیا نہ صرف تصوف، روحانیت اور بڑے تمدنوں کا مرکز رہا ہے بلکہ دُنیا کے تمام براعظموں سے بڑا ہے یعنی رقبے کے اعتبار سے پوری دُنیا کا نصف ہے۔ ترکی سے لے کر روس کے مشرقی سرے تک اس کا پھیلاؤ ہے۔ ایشیا ہی میں بلندترین پہاڑ ہمالہ بھی واقع ہے اور زیریں ترین علاقہ یعنی بحیرۂ مردار بھی۔ تمام براعظموں کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ آبادی ایشیا کی ہے۔ اولیں قدیم ترین تہذیب یعنی سمیری تمدن کا ظہور بھی یہیں ہوا۔ وسطی ایشیا چھے مسلم ریاستوں اور منگولیا وغیرہ پر مشتمل ہے تو مشرقی ایشیا میں چین، شمالی اور جنوبی کوریا اور جاپان جیسے ممالک آباد ہیں۔ جنوبی ایشیا جس سے خود اقبال کا تعلق ہے اپنے دامن میں پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت، برما، نیپال، افغانستان وغیرہ کو سموئے ہوئے ہے۔ خود سعودی عرب، ایران اور عراق کا تعلق بھی ایشیا ہی سے ہے۔ مشرقی بحیرۂ روم کے پہلو میں اردن اور ترکی وغیرہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن، سنگاپور، ویت نام اور تھائی لینڈ جیسے ممالک شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ اپنے شعری اور نثری آثار میں اقبال کی ایشیا سے گہری وابستگی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے اور اقبال کا اسے مرکز نگاہ بنانا بے محل نہیں۔ گویا ان کی ''نقشے از جمعیتِ خاور فگن'' کی تلقین اپنے اندر گہری حکمت رکھتی ہے۔ وہ مشرق کی نجات اور احیاء کے لیے ملتِ بیضا کے اتحادِ باہمی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ''طلوعِ اسلام'' میں کوئی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیے بغیر اُنھوں نے کس قدر واشگاف الفاظ میں کہا ہے:

یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

خود ''پس چہ باید کرد'' میں ''حرفے چند با اُمتِ عربیہ'' کے زیرِ عنوان اقبال نے عربوں کے شاندار ماضی، حال کی افسوسناک صورتِ حال اور ملتِ اسلامیہ کو آئندہ پیش آنے والے خطرات سے ایک بے مثل حکیم کے انداز میں متنبّہ کیا اور اتحادِ اسلامی پر زور دیا ہے۔ ایک طرح سے یہ زیرِ نظر کتاب کا سب سے اہم مبحث ہے۔ اقبال نے آیاتِ قرآنی اور حدیث کے حوالے سے نیز مختلف تاریخی مثالوں سے امتِ عربیہ کے لیے غیرت اندوزی کا سامان کیا ہے۔ اُنھوں نے عربوں کے بے پناہ تحرک، علم دوستی، بھائی چارے، حریت کیشی اور عالمی سطح کی تہذیب کو وجود میں لانے والے عناصر کی یاد تازہ کی ہے، حضورِ اکرمؐ کی سیرت سے موتی چنے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ جہاد بالسَّیف اور جہاد بالنَّفس کے باہمی اتصال ہی سے وہ کلید ہاتھ آتی ہے جس سے دونوں جہانوں کی کشاد ہوتی ہے۔ مسلم تہذیب ایک ہی وقت میں عقل کی کھیتی بھی سیراب کر رہی تھی اور قلوب کے لیے ایمانی سرور و سوز کا اہتمام بھی کر رہی تھی گویا روم و رَے (رومی و رازی) کے باہمی اتحاد کا منظرنامہ مرتب ہو رہا تھا اور اونٹ چرانے والے راکبِ تقدیر بن رہے تھے۔ اقبال کے اس موقف کی تصدیق تاریخ کی اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ صدیوں تک بغداد، سسلی اور ہسپانیہ سے علم و آگہی کے چشمے پھوٹتے رہے اور اہلِ مغرب بھی ان سے خوب سیراب ہوئے۔ مسلم تہذیب کے عروج نے مغرب کے نیند کے ماتوں کو بیدار کیا۔ ایک طویل عرصہ تک علمی وفکری انکشافات و ایجادات کے در کھلے رہے۔ اس اجمال کی کچھ مزید تفصیل یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ بغداد میں بیت الحکمت کے قیام نے ایک بے مثال علمی و انجذابی تحریک کو جنم دیا۔ محمد ابنِ موسیٰ الخوارزمی وہ پہلا شخص تھا جو بیت الحکمت سے وابستہ ہوا اور جس نے علمِ حساب کو عروج تک پہنچنے کا آغاز کیا۔ اہلِ ہند کا علمِ حساب اہلِ علم کے لیے نعمت تو تھا مگر ناقص تھا، اس نے اس میں صفر (Zero) کے عدد کا اضافہ کر کے اسے ایک نئی معراج سے آشنا کیا۔ اس نے الجبرے کو نئی راہیں سجھائیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے علمِ فلکیات کو الگ علم کا درجہ دیا اور اسے نجومیوں کے توہمات اور اساطیر سے نجات دی۔ ایران کے البیرونی، سسلی کے الادریسی، جالینوس کے تصوراتِ

طب کو چیلنج کرنے والے محمد ابنِ زکریا الرازی، ابن الہیثم، عمر خیام، ابن النفیس اور متعدد دیگر بے مثال علماء نے اکتشاف و آگہی کی حدیں وسیع کیں۔ یہ غور طلب بات ہے کہ جامع اور ہمہ گیر مسلم تہذیب کے مرتّبہ نظامِ تعلیم نے بیک وقت کیسے کیسے علما، فلاسفہ، فقہا، محدثین، ماہرینِ فنونِ لطیفہ، شعرا، ادبا، صوفیا اور ماہرینِ عمرانیات کو جنم دیا۔ مسلم اسپین علم کا بڑا مرکز بنا اور مغرب سے علم کے پیاسے مسلم ہسپانیہ کی درسگاہوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اور تو اور مغرب کے بعض دانشور اور مذہبی رہنما بھی ان علمی اداروں سے کسبِ علم کرتے رہے۔ کیتھولک چرچ کا پوپ سلویسٹر دوم مسلم ہسپانیہ میں تعلیم پاتا رہا وعلیٰ ہذا القیاس[1]۔ آج مغرب میں علوم کا حیرت انگیز تنوع نظر آتا ہے مگر ان علوم میں سے اکثر کی بنیادیں عرب اور ایرانی مسلمانوں نے فراہم کیں۔ گویا بقول اقبال عہدِ حاضر ''زادۂ ایام تست'' کی تفسیر ٹھہرا۔ پھر زمانے نے پلٹا کھایا اور اقبال ہی کے الفاظ میں عربوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ خویش دشمنی اور بیگانہ پیوستگی کا چلن ہوا۔ اقبال کا یہ خیال کس قدر درست ہے کہ عرب جب سے فرنگی کے چنگل میں پھنسے، آسمان نے اُنھیں ایک لمحے کے لیے امان نہیں دی۔ پھر انھیں تلقین کرتے ہیں کہ

ع در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ

المیہ یہ ہے کہ روحِ عمرؓ سے اعراض ہی کے نتیجے میں عربوں کی دیرینہ عظمت اُن کے ہاتھ سے چھن گئی، دُنیا کی سیادت کرنے والوں نے خود غلامی قبول کر لی۔ صرف بیسویں صدی کے سعودی عرب ہی کو لیجیے جہاں اقتدار کے حصول کے لیے ایک مدت تک جنگ و جدال کا بازار گرم رہا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ علاقہ جسے آج سعودی عرب کہتے ہیں، برطانیہ کے زیرِ تسلّط رہا۔ ۱۹۲۷ء میں برطانوی سیاسی شاطروں نے حجاز اور نجد کی حکومتوں کو تسلیم کیا اور ۱۹۳۲ء میں حجاز و نجد کے اتحاد سے

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے ر۔ک: Lost Islamic History (مصنفہ: فراس الخطیب)، القا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔ عالمی تمدن کے ارتقا اور علوم میں مسلمانوں کی بے مثال خدمات کے ضمن میں بریفالٹ کی ''تشکیلِ انسانیت'' اور فلپ کے حتّی کی ''اسلام اینڈ دی ویسٹ'' کے متقدّم حوالے تو اہلِ علم کے پیشِ نظر ہوں گے ہی۔

سعودی عرب کی آزادی کا اعلان ہوا مگر اب برطانیہ کے بعد یا اس کے ایماء سے میدان میں ایک دوسرا استعماری امریکہ کے روپ میں خم ٹھونک رہا تھا۔ لہٰذا برطانیہ سے زیادہ سعودی عرب میں امریکی اثرات بڑھنے لگے۔ اقبال یہ سب کچھ گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ برطانیہ کی ہوسِ ملک گیری تو اُن کے لیے خبر سے زیادہ نظر کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے زمانے میں عالمِ اسلام کا بڑا حصہ غلام تھا۔ مسلم ممالک اقبال کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ آزادی لیتے گئے مگر اب غلامی کی ذرا جدید اور جدید تر زنجیروں میں جکڑے جانے لگے۔ چنانچہ نام نہاد آزادی کے ایک ہی سال بعد امریکہ کے اشتراک سے سعودی حاکم ۱۹۳۳ء میں آرامکو (Aramco) کی بنیاد رکھتے ہیں جو آج بھی دُنیا کی چند بڑی تیل کی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اب ذرا اس تناظر میں عربوں کو اقبال کی طرف سے کیا جانے والا انتباہ ملاحظہ فرمائیے:

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر　　فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں　　اشترانش را ز حوضِ خود براں

یہ ایک بے مثال لطیف ایماء تھا اس امر کی طرف کہ اس فتنہ پرور استعمار کو اپنے حوضوں [تیل کے کنوؤں] سے دور رکھو[1]۔ مگر ایسا اب تک نہیں ہو سکا۔ استعمار کا پیرِ تسمہ پا آج بھی عربوں کو غاصب صہیونی ملک کو تسلیم کرنے کا حکم صادر کر رہا ہے اور اس کے بعد شاید پورے عالمِ اسلام پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ خود عرب شیوخ عیش کوشی کی جس دلدل میں پھنسے اور مسلسل قعر کی سمت ہاتھ پاؤں مارے بغیر ڈوبتے جا رہے ہیں اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کو بالخصوص اور ملّتِ اسلامیہ کو بالعموم کس آشوب سے دوچار ہونا ہے۔ اس صورتِ حال میں ''پس چہ باید کرد'' جیسے شعری صحیفے کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے اور اس میں شامل نسخہ ہائے شفا کے استعمال سے حیاتِ تازہ کا سروسامان کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ دُنیا کے ۲۶ فیصد پٹرول کے ذخائر سعودی عرب میں ہیں۔ لہٰذا استعمار کی رال ٹپکنا لازمی تھا اور ہے۔

آج عالمِ اسلام مغربی استعمار کے چنگل میں جس بری طرح گرفتار ہے وہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے (اور یہ صرف عالمِ اسلام ہی کا نہیں خود نیم ترقی یافتہ اور پس ماندہ ممالک مثلاً لاطینی امریکہ وغیرہ کا المیہ بھی ہے۔ مغرب کے اور ان کی تقلید میں ہمارے ہاں کے جو جدید دانشور مابعد نوآبادیات (پوسٹ کولونیلزم) ادب کا جائزہ لیتے ہوئے نام نہاد نوآزاد ملکوں میں لکھی جانے والی ردِ استعماری تحریروں پر خوشی کا اظہار کرتے رہتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے (اگرچہ مجھے شک ہے کہ انھیں معلوم نہ ہو) کہ پوسٹ کولونیلزم ایک پردہ پوش ڈسکورس ہے۔ کیا آج جنوبی ایشیا، عالمِ عرب اور لاطینی امریکہ کے رہنے والے واقعی صحیح معنوں میں آزاد کہے جا سکتے ہیں؟ استعمار نے صرف اپنے نقاب تبدیل کیے ہیں اور اب نئے استعمار کا دیوِ استبداد ملٹائی نیشنل کمپنیوں، آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی صورت میں ایک نئی استحصالی تاریخ رقم کر رہا ہے۔ اسے نیوکولونیلزم (Neo-Colonialism) تو کہا جا سکتا ہے ''پوسٹ'' کا مرحلہ تو عیّار مغربی شاطر آنے ہی نہیں دیں گے تا آنکہ صحیح معنوں میں احترامِ انسانیت کا حامل کوئی خدا ترس نظام اس کی جگہ نہیں لے لیتا۔ اقبال کے یہ شعر بلا تامل یاد آتے ہیں جو پس چہ باید کرد کے ذیلی باب ''در اسرارِ شریعت'' میں اہلِ مشرق کے لیے انتباہ کی صورت میں موجود ہیں:

ایں بنوک ایں فکرِ چالاک یہود　　نورِ حق از سینۂ آدم ربود!
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام　　دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جمال الدین افغانی کی زبانی اسی خوں آشام مالیاتی نظام کی اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں بھی مذمت کی ہے۔ حق یہ ہے کہ کمزور ممالک جب تک اپنے ناقابلِ تزلزل عزم اور مسلسل جدوجہد سے کام لے کر معاشی خودانحصاری کی منزل تک نہیں پہنچ جاتے، سچی اور حقیقی آزادی ایک خواب رہے گی۔

''پس چہ باید کرد'' میں دیگر بہت سے مضامین وہی ہیں جو اقبال اپنی پہلی معرکہ آرا شعری دستاویزات اسرار و رموز، بانگِ درا، بالِ جبریل، پیامِ مشرق، جاوید نامہ اور مثنوی مسافر میں تفصیلاً یا اجمالاً بیان کر چکے ہیں مگر ''پس چہ باید کرد'' کا بہت نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس میں مسلم تمدن کے عناصرِ ترکیبی اور اس کے خدوخال اُنھوں نے مثنوی کے مختلف ابواب میں بڑی سلاست سے اور اس سلیقے سے بیان کیے ہیں کہ ایک کڑی دوسری کڑی سے نہایت فنکارانہ انداز میں ملتی

چلی گئی ہے اور بالآخر ایک ایسی تحیّر خیز وحدت میں ڈھل گئی ہے گویا شاعر نے: کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے۔ اگر ایک جملے میں پوچھا جائے کہ ''پس چہ باید کرد'' کی تخلیق کا مقصد کیا ہے تو جواب یہ ہے: ''مللِ مشرق خصوصاً ملّتِ اسلامیہ کا احیا''۔ اقبال کا سینہ اس ایقان سے معمور ہے کہ مشرق کی صدیوں کی تاریخ اور مدنیتِ اسلام اخلاقی، ایمانی اور عمرانی فضائل کی بہرہ دار رہی اور اس نے نئی تہذیبوں کے خلق کرنے میں اپنا نہایت بنیادی کردار ادا کیا چنانچہ یہ اخلاقی، تمدنی، عمرانی اور ایمانی فضائل ایسے ہیں جن کو پھر سے زندہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نوعِ انسانی ایک خدا دوست، خدا پرست، خدا ترس اور توحید آگاہ منصفانہ نظام کے سایے تلے اپنی تخلیق کے حقیقی مقصد سے آگاہ ہوکر بامراد زندگی گزار سکے، ایک ایسی زندگی جس میں غیرت، احترامِ انسانیت، صلہ رحمی، مذہبی رواداری، استحصال سے پاک فضا، مساوات اور اعلیٰ تخلیقی مقاصد کی تولید و ترویج کے لیے آزادی کی نعمت میسّر ہو۔ مثنویاں اقبال نے پس چہ باید کرد سے پہلے بھی لکھیں مگر ''پس چہ باید کرد'' ان کا ایسا نقشِ آخر ہے جس میں انھوں نے اپنے فکری دفینے کے تمام موتی اُگل دیئے ہیں۔ ان کی پہلی معرکہ آرا مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی ان کے نظامِ فکر کا بڑا مربوط خاکہ پیش کرتی ہیں مگر ان میں اور پس چہ باید کرد میں فرق یہ ہے کہ اسرار و رموز میں اقبال نے توحید و رسالت کے موضوعات کے علاوہ انفرادی و اجتماعی خودی کی تولید و ترسیل کے لیے جو مطالب بیان کیے ہیں، ان میں جابجا چھوٹی چھوٹی حکایات کے پھول بوٹے ٹانک دیے ہیں شاید اس لیے کہ حکایات سے انسان کی خلقی مناسبت اور دلچسپی کے باعث ایمانی و اخلاقی مطالب سے ان کا ارتباط تاثیر کو دوچند کرنے کے لیے ضروری تھا مگر ''پس چہ باید کرد'' میں اقبال نے کہیں ایسا اہتمام نہیں کیا بلکہ سیدھے سبھاؤ سے اپنے مطالب کو نظم کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ مطالب اس ایقانی جذبے اور اتنی سلاست اور برجستگی سے شعر کے پیکر میں ڈھالے گئے ہیں کہ ان کی قدرتِ کلام، جو پہلے بھی قابلِ رشک تھی، اپنی انتہا کو چھوتی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مثنوی اقبال کے پورے فکری نظام نامے کا نہایت دلفریب خلاصہ کہی جا سکتی ہے۔ تیرہ ابواب پر مشتمل یہ مثنوی اسلام اور ثقافتِ اسلامی سے اقبال کے عشق کی ایک ایسی ایمان افروز داستان ہے جہاں اقبال نہ کہیں سپاٹ ہوئے نہ محدود۔ اقبال نے موسوی حکمت کے خصائص، فرعونی طرزِ فکر و زیست، اسلام کے فضائل، توحید

کی معنویت اور اس کے ثمرات، فقر کے معجزات، مردِ حُر کے بے مثل کردار، شریعت کے اسرار و رموز، معاصر سیاست اور اس کی شعبدہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں، اپنے اہلِ وطن کے افتراق اور عربوں کے عروج و زوال کا ذکر کرنے کے بعد اقوامِ شرق بالخصوص مسلمانوں کو کچھ بے لاگ اور چشم کشا مشورے دیے ہیں جن سے وہ ایک نئی، نتیجہ خیز اور بامراد زندگی کا آغاز کر کے انفرادی اور اجتماعی خودی کی معراج کو پہنچ سکتے ہیں۔ کتاب کا آخری باب ''درحضور رسالتمآبؐ'' ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑی نعت شاید اُردو اور فارسی ادبیات کے پورے ذخیرے میں نہیں مل پائے گی۔ جس طرح نبی اکرمؐ سے اقبال کا عشق ان کے پورے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اسی طرح ''پس چہ باید کرد'' کے تار و پود میں بھی رحمتِ عالمؐ کا ذکر جابجا رچا بسا نظر آتا ہے اور کتاب کے متعدد باب انؐ کے ذکر سے متجلّی ہیں۔ یوں کہیے کہ روحِ محمدیؐ پوری کتاب میں جاری و ساری ہے! ''درحضور رسالتمآبؐ'' میں حضورِ اکرمؐ سے اقبال کے عشق اور والہانہ پن اور اپنے ذاتی درد کا اظہار معراجِ کمال پر نظر آتا ہے۔

یوں تو ''پس چہ باید کرد'' کے سارے ابواب متقاضی ہیں کہ ان پر فرداً فرداً گفتگو کی جائے مگر یہ مختصر مقدمہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ البتہ متذکرہ بالا تیرہ ابواب میں دو بہرحال ایسے ہیں جن پر اظہارِ خیال لازم آتا ہے یعنی ''فقر'' اور ''پس چہ باید کرد'' (یہ بارھویں باب کا عنوان ہے اور کتاب کا بھی)۔

اقبال نے نفسِ فقر کے باب میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسے ایک نگاہِ راہ بیں اور ایک دلِ زندہ کا نام دیا ہے گویا مردِ فقیر کے دل و نگاہ بصیرت اور زندگی کی حرارت سے معمور ہوتے ہیں۔ اقبال نے دلِ زندہ اور حاملِ دلِ زندہ کی اہمیت کو متعدد جگہ واضح کیا ہے مثلاً ''دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ''۔۔۔الخ یا

''فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ''

فقر شیشے کو الماس کی سختی اور صلابت دینے کا نام ہے۔ اقبال کے نزدیک مردِ درویش ایک گدڑی میں کہاں سماتا ہے (مردِ درویشے نگنجد در گلیم) اقبال کا یہ قول سعدی کے اس مشہور قول کی یاد دلاتا

ہے جس کی عبارت یوں ہے:

دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو سلطان در اقلیمے نگنجند!

اقبال نے بعض دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی سعدی سے اختلاف کیا ہے۔ نہ صرف ''پس چہ باید کرد'' میں بلکہ اسے زیادہ صراحت سے ''زبورِ عجم'' میں بڑے طنطنے سے بیان کیا ہے:

چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجند
عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے

صرف یہی نہیں مردِ فقیر نعرۂ ''لاملوک'' لگاتے ہوئے سلاطین سے بھڑ جاتا ہے (مسلم تاریخ اور تصوف میں اس کی کئی روشن مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً امام احمد بن حنبل، قطب الدین بختیار کاکی، نظام الدین اولیا، بوعلی قلندر پانی پتی، سرمد وغیرہ)۔ خود اقبال بھی تو ''باسلاطیں درفتد مردِ فقیر'' کی ایک زندہ مثال تھے یعنی نعرۂ لاملوک لگانے والے۔ دراصل مسلم تاریخ کے مطالعے نے اقبال کو ایک غیر معمولی فکری توانائی ارزانی کر دی تھی۔ ''جاوید نامہ'' میں بھی تو اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے:

ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخواں
با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد — مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد

(پیغامِ افغانی باملّتِ روسیہ)

اقبال کے نزدیک مردِ فقیر دراصل شہباز ہوتا ہے اور شہباز سے کون کہہ سکتا ہے کہ اپنے شکار سے دستبردار ہو جا۔ پھر اپنے عہد کے زوال میں غلطاں مسلم اُمت کو اُس شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں جو اپنے گھونسلے میں سرنگوں اور واماندہ بیٹھا ہے اور فضائے نیلگوں میں پَر پھڑ پھڑانے اور سرعتِ سیر کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس صورتِ حال میں میر کا یہ شعر یاد آئے بغیر نہیں رہ سکتا:

صد موسم گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

آج کے بدقسمت عربوں اور کئی دوسرے مسلم ملکوں کی بھی یہی حالت ہے جو صیہونی/امریکی استعمار کے سامنے سرنگوں اور مسلسل پسپا ہیں اور ان کی زور گوئی کے آگے چوں تک نہیں کرتے۔ ان کی سالمیت اور دفاع کا ٹھیکہ اسی استعمار نے لے رکھا ہے۔ کاش انھیں کوئی سمجھا تا کہ: تا کجا بے

غیرتِ دیں زیستن۔ اور پھر زوال زدوں کو غیرت دلاتے ہوئے کہا ہے کہ تم شاہین زادے ہو کوّوں کی منڈلی میں نہ اُڑو اور نچلی شاخ پہ گھونسلا نہ بناؤ۔ حق یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل سے پایانِ عمر تک اقبال نو بہ نو پیرایوں میں افرادِ ملت کو مسلسل خود شناسی، بلند نگہی، عزمِ راسخ اور حُریتِ فکر کا درس دیتے رہے۔ یعنی طوفے خودکُن رِگر دِ ایوانے مگرد۔

''پس چہ باید کرد'' زیرِ نظر مختصر تخلیقی صحیفے کا اہم ترین باب ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ تہذیبِ مغرب پر اقبال کی تنقید کا آغاز تو بانگِ درا ہی سے ہو گیا تھا۔ کیا اس ضمن میں اقبال کی اُس نظم سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے جو غزلیات کے زیرِ عنوان بانگِ درا کے دوسرے حصے کے آخر میں درج ہے اور جس پر جلی عنوان کے طور پر مارچ ۱۹۰۷ء کا سنہ درج ہے۔ اس نظم میں ایک طرف اہلِ مغرب کو انتباہ کیا جا رہا ہے کہ اب تم غلام ہندوستان کو دکان مت سمجھو۔ وہاں کے عوام کو ایسا کھرا سکہ مت جانو جو تمھارے بازارِ استعمار میں چلے گا۔ اب تم انھیں اپنی مقصد برآری کے لیے استعمال نہیں کر پاؤ گے کہ ان میں اور خصوصاً ملّتِ اسلامیہ میں اب بیداری کی لہر بہر پیدا ہو رہی ہے۔ اس نظم کا زورِ کلام، اقبال کی مغربی تہذیب کے ضمن میں بے باک پیش گوئی: تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی[۱] الخ نیز ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی پیش قیاسی تینوں باتیں بے حد قابلِ توجہ ہیں۔ اس کے بعد تو اقبال کی نثری تحریروں اور شعری آثار میں تواتر کے ساتھ مغربی تہذیب کے زیادہ تر منفی عناصر کو نمایاں کیا جاتا رہا۔ دراصل ہر قوم اور تہذیب کا طرزِ زیست اس کے تصورِ حقیقت کے تابع ہوتا ہے۔ مغرب میں مارٹن لوتھر کی تحریک کے نتیجے میں جب دین و سیاست کی ثنویت کا چلن عام ہوا تو مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ قرار پایا اور معاشرے اور مابعد الطبیعیات کے ایک قوی ترین اور موثر ترین عنصر ہونے کے بجائے اب اس کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ یہیں سے ''ایں جہانیت'' پر ارتکاز اپنی شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا اور عیسوی زمین، سماوی ہدایت کے چشمۂ فیضان سے منقطع ہو کر خالص مادہ پرستی کی دلدل میں اُتر گئی۔ یوں

---

[۱] حیرت ہے کہ عبدالحمید کمالی جیسا باخبر دانشور اس شعر کو اشپنگلر سے متاثر قرار دیتا ہے، حال آنکہ یہ شعر جس نظم میں ہے وہ اشپنگلر کی Decline of the West سے گیارہ برس پہلے لکھی گئی تھی۔ ر۔ک مقالات عبدالحمید کمالی، ص ۱۸۰۔

عیاری، استعماری حربے اور جوع الارض اس کے لیے سب سے پُرکشش مقاصدِ حیات ٹھہرے۔ یورپ نے حلال وحرام کی تمیز اُٹھا دی اور ''اُمتے بر اُمتِ دیگر چرد'' کا المیہ ظہور پذیر ہوا۔ اقبال نے اسی کو ''از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است'' کہہ کر ''تہذیبِ نو'' (تہذیبِ مغرب) کو ''آدم دری'' کے عمل سے تعبیر کیا ہے اور یہ عمل سوداگری کی نقاب اوڑھ کر اپنے مذموم استعماری مقاصد پورے کرتا ہے۔

اقبال نے اپنے چھٹے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں بغیر کسی لگی لپٹی کے کس قدر کھل کر کہہ دیا تھا:

"Believe me Europe today is the greatest hindrance in the way of man's ethical advancement."

اپنے تیسرے خطبے ''تصوّرِ الٰہ اور حقیقتِ دُعا'' میں اقبال نے مغرب کے اس فسادِ فکر و نظر کا کس قدر بصیرت افروز تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کے پاس قوت تو ہے ویژن نہیں ہے اور ویژن کے بغیر قوت ایک ہولناک تخریبی شے بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ویژن اور قوت کے باہمی اتصال پر زور دیتے ہیں تا کہ نوعِ انسانی کی سچی روحانی توسیع کا امکان پیدا ہو۔

''پس چہ باید کرد'' میں اقبال مغرب کے تصورِ انسان کا اجمالاً ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ انسان کو محض ایک مادّی وجود سمجھتا ہے جبکہ انسان مظہرِ اسرارِ حق ہے۔ مسلم تصورِ علم انسان میں خدا خوفی کا احساس راسخ کرتا ہے مگر مغرب کے کج نظر تصورِ علم کے باعث اس کی آنکھ بے نم اور اس کا دل پتھر کا ہو گیا ہے۔ زیرِ بحث باب میں تہذیبِ مغرب پر اقبال کی تنقید ان کا شدید ترین ردِّعمل کہی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پہلی عالمی جنگ اپنے ہولناک اثرات ظاہر کر چکی تھی اور دوسری خوفناک عالمی جنگ کے امکانات پیدا ہو رہے تھے۔ یورپ کی معاشی لوٹ کھسوٹ اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی اور اس کے استعمار کا استبدادی دیو اپنے خون آشام عزائم کو عملی جامہ پہنانے میں لگا تھا۔ لہٰذا مغرب پر اقبال کی تنقید میں انتہائی شدت پیدا ہو جاتی ہے، ایسی شدت کہ اس کی مثال خود ان کے سابقہ شعری و نثری کارناموں میں نسبتاً کم نظر آتی ہے۔ اقبال کے نزدیک مغرب نے سچے علم کو شہر وصحرا میں رسوا کر دیا ہے[۱]۔ اس کی صحبت سے دور بھاگنا چاہیے

۱؎ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے جہت اور اقدار نا آشنا نام نہاد ''ترقی'' نے نوعِ انسانی کے وجود پر جو نہایت تشویشناک سوال قائم کر دیا ہے، اس کی تفصیل جاننے کے لیے جیمز برائڈل کی کتاب ''New Dark Age'' (۲۰۱۸ء) کا مطالعہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

کہ اس کی قربت جبریل ایسے جلیل القدر فرشتے کو بھی ابلیس بنا دے[1]۔ اس نے سچے علم میں مذموم علوم کی آمیزش کر دی ہے۔ یورپی استعمار کی منطق میں میمنے کا خون بھیڑیے پر حلال ہے۔ مغرب کفن دزد ہے اور جنیوا مکر و فن کا مرکز ہے (شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کرۂ ارض کی تقدیر بدلنے کے لیے جنیوا کے بجائے تہران کو عالمِ اسلام کا مرکز بنانے کے آرزومند ہیں۔ ر۔ک کلیاتِ اقبال، ص ۶۰۹)۔ اب اہلِ اسلام کو تلقین کا آغاز ہوتا ہے تاکہ وہ مغرب کی فتنہ پروری کا ادراک اور اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کر سکیں۔ ماضی کا مسلمان علم اور نئی دنیاؤں کے کھوج میں آتش زیرپا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ افرنگی تہذیب کا نشہ سر سے اُتار پھینک اور اس مغربی اہرمن کے چنگل سے خود کو آزاد کر۔ افرنگی ہمارے وجود پر نشتر چلا رہا ہے۔ وہ ایک عیار سوداگر ہے، اس کی چال میں نہ آ۔ اس کے ریشم کو تج کر اپنا موٹا جھوٹا کھدر الباس پہن۔ اپنے بوریے پر قناعت کر اور اس کے بدلے افرنگ کا قالین مت لے۔ غور کیا جائے تو معاشی خود انحصاری کی یہ ترغیب کمزور قوموں کے لیے کس قدر حیات بخش ہے۔ یہی سبق ایک سال قبل بالِ جبریل میں بھی تو دیا تھا:

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

بلکہ اس سے بھی قبل بانگِ درا میں کہہ چکے تھے:

کب تلک طور پر دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

پھر کہتے ہیں کہ فرنگی تاجر کی مُشک فروشی پر نہ جا۔ یہ کستوری ہرن کے نافے کے بجائے نافِ سگ سے حاصل کی گئی ہے یعنی نجس اور ناپاک ہے، لہٰذا قابلِ نفرت۔ مزید یہ کہ فرنگی کی مے چکھنے سے گریز کر کہ جو بھی اس مَے کا چشیدہ ہوا اسے اُسی میخانے میں موت آ گئی۔ اقبال

---

[1] ضربِ کلیم کا ایک شعر یاد آتا ہے، اقبال خدا سے خطاب کرتے ہوئے اور سیاستِ افرنگ کی قلعی کھولتے ہوئے کہتے ہیں:

بنایا ایک ہی ابلیس خاک سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

کے ان خیالات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے مغرب کے ناقص تصورِ علم، سطحی تصورِ حقیقت اور تاجرانہ ذہنیت کی قلعی کس گہرے ادراک اور نہایت بے باکی سے کھولی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیرِ نظر مبحث میں مغرب کی کراہیت آمیز تاجرانہ عیاری اور اندھی قوت کے بل پر استوار اس کے خوں خوار استعماری نظام کے خلاف اقبال ایک شمشیرِ برہنہ، ایک اُپی جوہری تلوار نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک افسوسناک امر کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جس کا اظہار معروف اقبال شناس ڈاکٹر محمد ریاض ''پس چہ باید کرد'' (ترتیب ونثری ترجمہ جس میں سعادت سعید شریک مرتّب ومترجم ہیں) کے اُردو ترجمے کے دیباچے میں ایک مدت پہلے اجمالاً کر چکے ہیں[۱]۔ دراصل جس زمانے میں اقبال کی ''پس چہ باید کرد'' منصۂ ظہور پر آئی، اقبال پچھلے ایک برس سے گلے کی شدید بیماری میں مبتلا تھے۔ علالت اور مالی مشکلات کے باعث ریاست حیدرآباد کے ذمہ داران کے ساتھ رابطے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پہلے علامہ کے صاحبزادے آفتاب اقبال نے اور جلد بعد اقبال کے نہایت قریبی دوست سردار امراؤ سنگھ شیر گل نے سر اکبر حیدری کے ساتھ، جو اس زمانے میں صدراعظم حیدرآباد تھے، خط کتابت کی۔ خط کے جواب میں تاخیر ہوئی تو سردار صاحب نے انھیں یاددہانی کا خط لکھا جس میں اقبال کی بے مثال علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے ضمن میں درخواست کی تھی کہ ان کی مالی مدد کی جائے۔ اس کے جواب میں جو خط اکبر حیدری نے سردار امراؤ سنگھ کو لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے خلاف ریاست حیدرآباد میں کوئی انکوائری ہو رہی تھی۔ یہ انکوائری کیا تھی اس کا پتا اکبر حیدری کے نام سردار صاحب کے جوابی خط سے ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انکوائری اس باب میں ہو رہی تھی کہ اقبال نے اپنی کتاب ''پس چہ باید کرد'' میں مغرب کے سلسلے میں اس قدر معاندانہ رویہ کیوں اختیار کیا ہے۔ غالباً اس صورتِ حال کی بھنک اقبال کے کانوں میں بھی پڑی ہوگی جس کا ثبوت ایک ہزار روپے کے اس چیک کی واپسی ہے جو اکبر حیدری نے بالآخر اقبال کو بھیجا تھا۔ اقبال نے اسے قبول کرنے سے معذرت کی

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے مجلّہ اقبالیات (لاہور)، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء میں سیّد شکیل احمد کا تحقیقی مقالہ ''حیاتِ اقبال کے چند نئے گوشے''، ص ۳۳ تا ۳۶۔ یہ تحقیقی مقالہ آندھرا پردیش آرکائیوز میں محفوظ اقبال مٹیریل کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض کے مقدمے کا ایک حصہ اسی مقالے پر مبنی ہے۔

تھی اور حیدری کے نام وہ منظوم خط لکھا تھا جو ان کے بعد از وفات شائع ہونے والے مجموعے ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہے[۱]۔ واضح رہے کہ مذکورہ چیک یومِ اقبال کی مناسبت سے جو مسلم کلچرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ۷؍جنوری ۱۹۳۸ء کو منایا گیا تھا، بھیجا گیا تھا۔ بہ سہولت اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلسل گرتی ہوئی صحت اور دیگر آلام و مصائب کی موجودگی میں مندرجہ بالا انکوائری کی خبر نے اقبال کے دُکھ میں کتنا اضافہ کیا ہوگا!

''پس چہ باید کرد'' کے محتویات اور مطالب پر تو کسی قدر گفتگو سابقہ اوراق میں ہو چکی، اب اختصار کے ساتھ اس مثنوی کے فنی خصائص کی طرف چند اشارے کرنا بھی ضروری ہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مثنوی اپنی روانی، سہولتِ اظہار اور سلاست کے اعتبار سے اقبال کی سابقہ مثنویات مثلاً اسرار و رموز سے بڑھ کر ہے۔ اقبال یہاں اپنے فن کی انتہائی معراج پر نظر آتے ہیں۔ کتاب کے پہلے باب ''تمہید'' سے لے کر ''در حضورِ رسالتمآبؐ'' تک اقبال کا زورِ کلام باب در باب بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔ اس زورِ کلام کو تاثیر اس ندرتِ اظہار اور نادر تشبیہات سے بھی ملی ہے جن کا استعمال اقبال نے جا بجا کیا ہے۔ مثلاً پیرِ رومی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے افکار و عرفان کے خیمے کے لیے رسی کہکشاں سے بناتے ہیں کس قدر نادر ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ رنگوں کے نیرنگ میں بے رنگ رہ۔ دوشِ فقیر پر خرقہ بھی بار سے کم نہیں لہٰذا مثلِ صبا کاندھے پر بوئے گل کے سوا کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے (چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر)۔ مہرِ عالمتاب سے خطاب کرتے ہوئے بھی نادر تشبیہات بروئے کار لائے ہیں مثلاً کہتے ہیں اے سورج تیری سنہری کشتی جو دستِ موسیٰ سے زیادہ روشن ہے چاندی جیسی ندی میں بہتی جا رہی ہے۔ حکمتِ فرعونی پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے نوجوانوں کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نوجوانوں میں آرزوؤں کو ثبات و قرار نہیں گویا وہ اپنی امہات کے بطن سے مردہ پیدا ہوئے ہیں۔ رہی حکمتِ فرعونی کے علمبرداروں کی نوجوان لڑکیاں تو وہ عیش میں ڈوبی ہوئی ہیں اور جسم کی نمائش کو ہنر اور عریاں لباسی کو آرٹ سمجھتی ہیں۔ ذرا تشبیہ ملاحظہ کیجیے:

---

[۱] ر۔ک کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۶۹۰۔

ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر　　　　سینۂ ماہی بموج اندر نگر

''مردِ حُر'' کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بے پایاں سمندر ہے۔ لہٰذا روحانی اور فکری طور پر اس سے سیراب ہونا چاہیے، پرنالے سے نہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ مردِ حُر کا سینہ دیگ کی طرح جوشاں رہتا ہے اور جہاد کے دن وہ اپنی قبر اپنی تلوار سے کھودتا ہے۔ اصل فارسی شعر میں ندرتِ خیال کے تیور دیکھیے:

روزِ کیں آن محرمِ تقدیرِ خویش　　　　گورِ خود می کند از شمشیرِ خویش!

اسی طرح سیاسیاتِ حاضرہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کاروانِ سیاست کا امیر، نورِ جاں سے خالی ہے وہ تن پرست، اقتدار مست اور کم نظر ہے۔ وہ پیدا تو حرم میں ہوا مگر ارادت کلیسا سے رکھتا ہے (غالباً آلِ سعود کی طرف اشارہ ہے)۔ ایسے شخص کی سیادت قبول کرنا اور اس پر تکیہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے سگِ کور سے ہرن کا شکار کرنے کا قصد کرنا:

اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد　　　　صیدِ آہو با سگِ کورے نکرد

اور اب آخر میں ایک بات اور۔ ''پس چہ باید کرد'' کے مطالعے کے دوران میں کئی مرتبہ اس سوال سے دوچار ہوا کہ کیا محض ''اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں'' اور ''حرفے چند با امتِ عربیہ'' تک اس بے مثل شعری کارنامے کو محدود رکھنا اپنے بے نظیر شعری کمالات اور غیر معمولی فکری ثروت کی تحدید نہیں۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ شاید اقبال کو مسلسل علالت اور دیگر تردداتِ کے باعث اس امر کا احساس ہو چلا تھا کہ اب عمر کی نقدی ختم ہونے کو ہے لہٰذا اُنھوں نے صرف مشرق کی دو عظیم تہذیبوں کے عروج و زوال اور آئندہ کے لائحۂ عمل تک خود کو محدود رکھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کا جذباتی، جسمی اور جغرافیائی تعلق غیر منقسم برعظیم سے تھا اور دینی، ایمانی اور روحانی تعلق سرزمینِ حجاز سے (آرزو دارم کہ میرم در حجاز!)۔ یہ دو بڑی مؤثر اور آموز گار تہذیبیں تھیں جن سے بعد کے کئی تمدن بہ شمول مغرب صدیوں تک فیض یاب ہوتے رہے۔ اقبال اسلام کو ایک عالمگیر آفاقی دین سمجھتے تھے اور بجا طور پر۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ اس دین کا تصورِ حقیقت، تصورِ الٰہ و انسان و کائنات اور اس کا عالمی زاویۂ نظر (World View) دیگر قوموں کے لیے ایک زندہ اور حیات بخش نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ لہٰذا کیا پیامِ مشرق، کیا جاوید نامہ،

کیا مثنویِ مسافر اور کیا اسرار و رموز، ان سب میں اُنھوں نے ایک ہی آفاقی پیغام کے خصائص اور خدوخال شرح و بسط اور ایک خلاقانہ کیفیت کے ساتھ واضح کیے ہیں۔ رہی مشرق کی دیگر قومیں تو نہیں بھولنا چاہیے کہ اقبال نے اپنی ابتدائی نثری تحریر ''قومی زندگی'' میں جاپان و افغانستان کے سلسلے میں اپنے انتباہات اور خیالات کا کھل کر اظہار بھی کیا ہے۔ افغانستان پر تو ان کی پوری ''مثنوی مسافر'' موجود ہے۔ چینیوں کی بیداری کے امکانات پر ''ساقی نامہ'' میں اظہارِ مسرت کیا ہے۔ رہا یہ خیال کہ اُنھوں نے ایشیا یا مشرق کے تمام ممالک یا مؤثر تمدنوں کا ذکر نہیں کیا تو اقبال اس کے مکلّف نہ تھے نہ ہمیں کسی شاعر سے اس کا تقاضا کرنا چاہیے۔ ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو اقبال کی مثنوی ''جاوید نامہ'' ان کی کمال درجے کی وسعتِ نظر کی گواہ ہے اور اس کے منظرنامے پر دُنیا کے بڑے بڑے مفکر، صوفی، دانشور، فلسفی، شعرا اور ادیان و مذاہب کے نمائندوں کے باہمی مکالمے کا حیران کن اور نہایت فکر افروز اہتمام کیا گیا ہے۔ جس زمانے میں اقبال کی اسرارِ خودی کا ترجمۂ نکلسن شائع ہوا، بعض برطانوی دانشوروں نے اقبال پر مذہبی فرقہ واریت کا الزام عاید کرنا چاہا۔ اقبال نے ان کے جواب میں نکلسن کو جو خط لکھا، اس کی عبارت نہایت درجہ قابلِ توجہ ہے۔ ان کا موقف تھا کہ اسلام کا بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے ذکر ایک آفاقی معاشرے کی تشکیلِ نو کے لیے نمونے کے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ جواب صرف اسرار [و رموز] ہی پر موزوں نہیں بیٹھتا ''پس چہ باید کرد'' کے حوالے سے بھی اتنا ہی موزوں اور متوازن ہے۔ اقبال کے خیال میں:

> "The object of my poems is not to make out a case for Islam; my aim is simply to discover a universal social reconstruction, and in this endeavour, I find it philosophically impossible to ignore a social system which exists with the express object of doing away with all the distinctions of caste, rank and race; and which while keeping a watchful eye on the affairs of this world, fosters a spirit of unworldliness so absolutely essential to man in his relations with

his neighbours. This is what Europe lacks and this is what she can learn from us."

(Thoughts & Reflections of Iqbal, pp100-101)

یوں تو فکرِ اقبال کا پورا سرمایہ میرے لیے الہام گیری (Inspiration) کا سبب رہا ہے مگر ان کے شعری کارنامے تو کم وبیش سارے کے سارے ہی میرے لیے مسرت، بہجت اور حکمت آموزی کا سامان رہے ہیں۔ ''پس چہ باید کرد'' کا مطالعہ میں نے آج سے کوئی تیس برس پہلے کیا اور پھر متعدد بار کیا۔ خیال آیا کہ کیوں نہ اس کا منظوم اُردو ترجمہ کر دوں کیونکہ اب ملک میں فارسی کا چلن وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ اسی احساس کے پیشِ نظر میں نے کوئی پچیس برس پہلے اس کے چند حصوں مثلاً ''بہ خوانندۂ کتاب''، ''تمہید'' اور ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کے ایک حصے کا آزاد منظوم ترجمہ کیا جسے میں نے اپنے دوسرے شعری مجموعے ''شاخِ زریاب'' (۲۰۱۲ء) میں شامل کیا۔ یہ ترجمے الگ سے بھی بعض ادبی مجلّوں میں شائع ہوئے۔ ان تراجم کو اہلِ علم نے پسند کیا۔ اِس سال فروری کے اوائل میں مَیں نے نہ صرف اپنے سابقہ ترجمہ کردہ حصوں پر نظرِ ثانی کی بلکہ پوری کتاب ہی کا ترجمہ کرنے کی ٹھانی اور الحمدللہ کہ ایک ڈیڑھ مہینے میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ترجمے میں مَیں نے اصل متن سے حتی الوسع وفادار رہنے کی کوشش کی ہے مگر جہاں ناگزیر تھا بعض کلمات کا قلابین میں درج کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ مَیں نے اس ترجمے پر کئی بار نظر ڈالی اور ترمیمات کیں۔ بعد ازاں ممتاز دانشور ڈاکٹر خورشید رضوی سے بھی مسودے پر نظرِ ثانی کی درخواست کی۔ اُنھوں نے ترجمے کو بڑی دقّتِ نظر سے دیکھا اور نہ صرف بعض اسقام کی نشاندہی کی بلکہ چند مصرعوں کے متبادل تراجم بھی میری سہولت کے لیے تجویز کر دیے۔ مَیں نے ان کے بیشتر مشوروں کو مفید اور موزوں پایا اور ترجمے میں مناسب ترامیم کر لیں۔ میں اس کرم کے لیے ڈاکٹر صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔

''پس چہ باید کرد'' کے متعدد اُردو، ایک دو پنجابی اور ایک انگریزی ترجمہ شائع ہو چکے ہیں۔ یقیناً اور بھی ہوں گے۔ میرے حساب میں پیشِ نظر آزاد منظوم ترجمہ شاید پہلا ہے۔ اُمید ہے قارئین اور فکرِ اقبال کے دلدادگان اس ترجمے سے لطف اندوز ہوں گے ہاں اس میں موجود کمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی میں بھی تامل نہیں کریں گے۔ اُردو ترجمے کے ساتھ اصل فارسی متن

بھی کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے تا کہ قاری کو تقابل کی سہولت رہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے راقم اقبال اکادمی کی ناظم محترمہ ڈاکٹر بصیرہ عنبریں کا شکر گزار ہے جن کی بار بار کی یاد دہانی مجھے مہمیز کرتی رہی۔ خدا کرے کہ یہ ترجمہ فکرِ اقبال کی ترویج و اشاعت میں معاون ہو اور اس سے ملّتِ اسلامیہ کے قلوب حرارت اندوز ہو سکیں۔ کتاب کا انتساب اپنے رنگ کے واحد فلسفی، نامور دانشور اور دردمند پاکستانی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے نام کیا گیا ہے جن سے مجھے بے حد تعلقِ خاطر تھا اور جن کے خوانِ علم کا میں ریزہ چین رہا ہوں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

لاہور، ۲۲ر دسمبر ۲۰۲۰ء

کتاب کے قاری سے

○

[یہ فیصلہ ہے مرا اب کہ] مُلکِ عشق سے میں
سپاہِ تازہ منظّم کروں برائے جہاد
کہ ہے حرم کو خطر عقل کی بغاوت سے
زمانہ واقفِ حرفِ جنوں نہیں ورنہ
یہی قبا ہے کہ موزوں خرد کے جسم پہ ہے
میں اُس مقام پہ فائز ہوں، اِس کو اپنا کر

کہ اب خرد کے لیے باعثِ سعادت ہے
اگر وہ میرے در و بام کا طواف کرے
یہ مت سمجھ کہ قیامت نہیں خرد کے لیے
نگاہِ بندۂ مومن بھی اک قیامت ہے !

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

مرشدِ رُومی، قلبِ منور رکھنے والا مرشد
قافلۂ عشق و مستی کا سالارِ خوش خو
ماہ و مہر سے کوسوں آگے ہے اُس کی منزل
اپنے خیمے کے لیے رسّی کاہ کشاں سے بنانے والا
[ایسا ارفع، اعلیٰ]
طاق اُس کے سینے کا منور مشعلِ قرآنی سے
جامِ جم اس کے آئینے کے آگے شرمندہ

اس پاکیزہ فطرت شاعرِ شور انگیز نے
اپنی لَے سے دوبارہ
میرے روئیں روئیں میں
ایسی آگ لگا دی
جو کبھی بجھ نہیں سکتی!

اس نے کیا ارشاد:
مشرق نے گہری انگڑائی لے کر خواب کو تج ڈالا ہے
جانیں اب اسرار کی محرم ہونے لگی ہیں
ذاتِ حق نے پرانے بندھن اپنے قوی ہاتھوں سے کھول دیے ہیں
اور اہلِ مشرق کو تازہ جذبوں کا تحفہ بھیجا ہے
اے اقبالِ بینا ــــ اسرارِ افرنگ کے دانا!
اس عہدِ کم بیں میں نارِ فرنگ کی لپٹوں کو
تیرے سوا ہے کون کہ جس نے بے بیم و بے خوف
اپنے سینے سے لپٹا کے گل وگلزار کیا؟
مثلِ خلیل اللہ فقط تو مستِ مئے حق رہ
ہر بت خانۂ کہنہ تیرے ہاتھ سے جائے ڈھے
[تجھ کو خبر ہے]
جذبِ دروں کی قوّت سے قومیں زندہ رہتی ہیں

اور احمق اس جذبِ دروں کو پاگل پن کہتے ہیں
کون ایسی ملت ہے ذوقِ عشق بِنا جس نے
میدانِ ہستی میں کوئی معرکہ مارا ہے؟
مومن تو بس عزم و توکل کے دم سے قاہر ہے
گر محروم ہو اِن دونو سے، پھر وہ نِرا کافر ہے
مومن ـــــ خیر و شر کا فارِق
اس کی نگاہیں عالم عالم زلزلہ ڈالنے والی
اس کی ضرب سے سلسلۂ کُہ ریزہ ریزہ
لاکھ قیامتیں خمیازہ کش اس کے گریباں بیچ
میرے مے کدۂ عرفاں سے پینے والے شاعر!
میری اِس لَے کے فیضاں سے
تو نے ہر فرسودگی کو نابود کیا ہے
باغِ جہاں میں مثلِ خوشبو رہ مستور و فاش
رنگوں کے نیرنگ کے اندر رہ یک سَر بے رنگ
تیرا زمانہ رمزِ جاں سے بالکل ناآگاہ
غیر اللہ سے اُلفت اُس کا دیں، اُس کا ایماں
فلسفی بھی رمزِ جاں سے آگاہ نہیں
اس کی آنکھ اسیرِ ظواہر

اس کی بے توفیق نگاہیں
دل کی شمعِ کافوری سے کسبِ ضیا نہیں کرتیں
اِسی لیے تو وہ توحیدِ فکر سے ہو کر عاری
سرخ و کبود و زرد کی رنگارنگی کا قیدی ہے!
خوشا وہ شخص جو اپنی متاعِ دل کا ہو نگراں
اور جو غیر اللہ کی زنجیروں سے ہو آزاد
گاو و میش کو کیا معلوم کہ شیری ہے کیا شَے
جز شیروں کے اَور کسی سے دل کی بات نہ کہہ
کیا ہو حریفِ سفلہ کی صحبت میں لُطفِ مَے
ہو وہ اگرچہ شاہنشاہِ روم و شام و رَے
بے شک اپنے یوسف کو کوئی گُرگ اُچک لے جائے
اِس سے بہتر ہے کہ کوئی نیچ اس کے دام لگائے
محرومِ تخیل و تصور دنیا کے متوالے
اطلس سے ناواقف ہیں یہ بوریا بُننے والے!
اک عجمی شاعر نے کتنی اچھی بات کہی ہے
جس کے اثر سے جسم کے اندر رُوح پگھل جاتی ہے
اس کا ہے ارشاد:

''دنیا والوں کے کانوں میں عاشق کی فریاد
افرنگی کے دیس میں گویا بانگِ مسلمانی ہے''[ا]
اے اقبال! ان اہلِ حق کو
دین و سیاست کے معنی سے پھر سے کر آگاہ
غم کھانا اس نان سے بہتر ہے جو بڑھائے غم
عاشق غم کھاتا ہے، بچہ بالا شکر اڑائے
دوشِ فقیر کو اس کا خرقہ بھی لگتا ہے بار
مثلِ صبا کاندھے پر بوئے گل کے سوا
کوئی بوجھ نہ ڈال
[اے آدم کی آل!]
تُو ہے سمندر تو صحرا سے دست و گریباں ہو
اور اگر شبنم ہے تو کر خود کو نذرِ گل برگ
مردِ حق سے رازِ حق پوشیدہ رہ سکتا ہے؟
کیا تجھ کو معلوم ہے روحِ مومن ہے کیا شے؟
روحِ مومن؟ — ایسا قطرۂ شبنم
ذوقِ نمود کی سرشاری سے
اپنے ہاتھ سے اپنا عقدہ کھولنے والا

ا ''نالۂ عاشق بہ گوشِ مردم دنیا۔ بانگِ مسلمانی و دیارِ فرنگ است''!

ذوقِ خودی کے دم سے اپنے دل کا محرم
نیلِ فلک کے گوشۂ تنہائی کو تج کر
بے پایاں دریا کی جانب سے منہ موڑے
سیپ کے خلوت خانے سے ہر آن گریزاں
آخرِ کار اک لمحے کو آغوشِ سحر میں تڑپا
اور پھر اک نورس غنچے کے منہ میں ٹپک گیا
[کیا بے جھپک گیا!!]

❁❁❁

مہرِ عالمتاب سے خطاب

○

اے روشن سورج، مشرق کے بادشہِ اعلیٰ
تیرے فیض سے ہر ذرے کے دل میں پیدا نُور
ہر پنہاں تیرے دم سے شیدائے ذوقِ نمود
کائنات میں تیرے دم سے سارا سوز، سرور
چاندی جیسی نہر کے اندر تیری زرّیں کشتی
رواں دواں ہے اور یدِ موسیٰ سے روشن تر!
ماہ کو تیرے پرتو نے ہی [ٹھنڈا] نور دیا
پتھر کے باطن میں لعل کو بخشی تو نے چمک
تیرے فیض سے لالے کو باطن کا سوز ملا
تیرے دم سے اس کی رگوں میں موجِ خوں گرداں

اپنے گریباں چاک کیا کرتے ہیں گلِ نرگس
تا کہ تیری کرنوں سے کُچھ ان کو بھیک ملے
صبحِ مراد کے لانے والے [پگ پگ] جم جم آ
تیرے فیض سے ہر ہر بوٹا نخلِ طور ہوا
تو ہے فروغِ صبح اور میں ہوں دن کا آخری دم
روشن کر دے میرے ضمیر کے اندر ایک چراغ
میری اندھیری خاک کو سر تا پا کر دے روشن
اپنے نور میں اس خاکِ تیرہ کو کر مستور
[مثلِ نخلِ طور!]
تا کہ مشرق کے افکار کی شب دن میں ڈھالوں
مشرق کے احرار کے سینے سوز سے میں بھر دوں
اپنی نوا سے خام کو بخشوں سختی اور سہار
وقت کے جامد پہیے کو پھر سے گرداں کر دوں
تا کہ فکرِ مشرق قیدِ فرنگ سے ہو آزاد
تا کہ اسے مرے نغموں سے آب و رنگ ملے
زندہ و پائندہ ہے انساں ذکر کی گرمی سے
حریت و آزادی عبارت فکر کی عفت سے

جب بھی قوم کے طرزِ خیال میں در آتی ہے خرابی
خالص چاندی اس کے ہاتھ میں کھوٹی ہو جاتی ہے
[قسمت سو جاتی ہے]
اس کے اندر قلبِ سلیم کی ہو جاتی ہے موت
سیدھا رستہ اس کی نظر میں ٹیڑھا ہو جاتا ہے
حرب وضرب وحرارت سے وہ لیتا ہے منہ موڑ
اس کو بھلا لگنے لگتا ہے بے حس ہو جانا
اس کے سمندر کی موجوں کو آ جاتی ہے موت
اس کا گوہر مثلِ خزف بے وقعت ہو جاتا ہے
پس لازم ہے اول اس کی فکر میں ہو تطہیر
تا کہ بعد ازاں راحت سے فکر کی ہو تعمیر

❁❁❁

کلیمی حکمت

○

جب بھی نبوت حکم الٰہی کا اجرا کرتی ہے
پاؤں کی ٹھوکر پر حکمِ سلطانی کو رکھتی ہے
قصرِ شاہی اسے پرانا بت خانہ لگتا ہے
اس کی غیرت حکمِ غیر گوارا کب کرتی ہے
اس کے فیضِ صحبت سے ہر خام کو استحکام
کون و مکاں کو اک تازہ ہنگامہ ہو انعام
تا کہ دامِ فریب سے مردِ حق آگاہ رہے
اللہ بس اور باقی ہوس، ہے مرسل کا پیغام

جبریل و قرآں کا معنی اس کا وجودِ پاک
فطرتِ ربّی کی ہے محافظ وہ ذاتِ لو لاک
عقل کی عیاری سے اس کی حکمت بالاتر
اُس کے ضمیرِ پاک سے ابھرے امت کا پیکر
حاکمِ اعلیٰ، تخت و تاج سے مستغنی [واہ وا]
فوج، خراج، کلہ کی طلب سے مطلق بے پروا
اس کے فیض سے فصلِ خزاں پل بھر میں بہار ہوئی
جام کی تلچھٹ، مے سے زیادہ نشّہ دار ہوئی
اس کی آہِ سحر گاہی سے دھڑکے نبضِ حیات
اس کی صبحِ نمود سے عالمِ کون و مکاں کو ثبات
اس کے طوفاں سے ہنگامہ بحر و بر میں ہوا
موجزن اس کی آنکھوں میں پیغامِ ''برہم زن''
''کیسا خوف اور کیسا ڈر'' یہ دیتا ہے پیغام
تا کہ آدم کے سینے میں دل کو ملے ثبات
آدم کو تسلیم و رضا و عزم سکھاتا ہے
اس کو مثالِ شمع میانِ دہر جلاتا ہے
تن کے اندر روح دگرگوں کر دیتا ہے وہ
اُس کی صحبت پارۂ گِل کو

گوہرِ یکتا کر جاتی ہے
اس کی حکمت ہر خالی کو بھر جاتی ہے
درماندہ اور عاجز بندے سے مرسل کہتا ہے:
اُٹھ اور باندھ کمر
ہر کہنہ معبود کو [بڑھ کر] ریزہ ریزہ کر
اے مردِ حق انگڑائی لے "میرا رب اعلیٰ ہے" کہہ کر
اس کہنہ بت کدے کے ہر ہر سحر کو باطل کر
فقر کا طالب ہے تو، تہی دستی کا غم مت کھا
اطمینان تو حال میں ہے کب جاہ و مال میں ہے
صدق، اخلاص، نیاز و سوز و درد ہی جوہر ہے
سونا، چاندی، سرخ اور زرد قماش ہے ادنیٰ شے
چھوڑ خیالِ کیکاؤس و کَے اے زندہ مرد
اپنے گرد پھرا کر پیارے، مت ایوان کے گرد
تو اپنی منزل کو کھو کر بھٹک رہا ہے دُور
تو شاہیں زادہ ہے، کرگسِ مردہ خور نہیں
جو طائرِ آزاد ہو، پوری آزادی سے وہ
باغ کے اندر اونچی شاخوں دو شاخوں کے بیچ

اپنا اک ننھا سا مسکن دیتا ہے تشکیل
اے مردِ حق، تیری فکر ہے گردوں رس لاریب
ہرگز خود کو مرغِ حقیر سے کم مایہ مت جان
نئے سرے سے نُہ افلاک کی رکھ اصل و بنیاد
اپنے دل کی چاہ سے تازہ عالم کر تعمیر
چونکہ فنا مستور و مضمر حق کی رضا میں ہے
مومنِ قانت تقدیرِ حق میں ڈھل جاتا ہے
اس کے قلبِ پاک سے صادر
آبی رنگ فضا کے جلو میں چار اطرافِ جہاں
حق کی رضا میں مانندِ اسلاف فنا ہو جا
اپنا گوہر سیپ کے باطن سے باہر لے آ
اینٹ اور پتھر کی اس اندھیری دنیا کے اندر
اپنی سلامتیِ فطرت سے آنکھیں روشن کر
پہلے جلالِ حق کی شان سے اپنا حصہ لے
بعد جمالِ حق سے فیض کی کُچھ امید لگا
عشق و مستی کا آغاز جلال سے ہوتا ہے
عشق و مستی کا انجام جمال سے ہوتا ہے

حسنِ کمالِ موجودات کا مظہر مردِ حق
وہی وجود ہے باقی جو کچھ ہے وہ محض نمود[1]

جب توحید سے سوز و تاب و تب حاصل کر لے
مہر و ماہ کی گردش اس کے تابع ہو جائے

❁❁❁

---

[1] اثباتِ خودی کے باب میں اقبال نے یہی بات بالِ جبریل میں کہی:

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی! (مترجم)

حکمتِ فرعونی

○

دیں والوں کی حکمت میں نے کردی خوب بیاں
اہلِ کینہ کی حکمت کا بھی سن کُچھ احوال
کینے والوں کی حکمت ہے مکر و فریب و فن
مکر و فریب ہے کیا؟ تخریبِ جاں، تعمیرِ تن
دین و شریعت سے آزادی اِس حکمت کا نام
منزلِ شوق سے دور اُفتادگی اس حکمت کا نام
مکتب اس کی تدبیروں سے پاتا ہے تنظیم
تا کہ غلام میں خوئے غلامی مستحکم ہوجائے
''شیخِ ملت'' اپنے لچھے دار سخن کے ساتھ
استعمار کے حسبِ منشا گرمِ عمل ہوکر

دینِ متیں کی نئی نئی تعبیریں کرتا ہے
ان کینے والوں کے ہاتھوں وحدتِ قوم دونیم
اس ناسور کا اک ہی مداوا یعنی چوبِ کلیم
وائے قوم کہ غیر کی عیّاری کا ہدف بنے
اپنی خرابی پر آمادہ اور تعمیرِ غیر
علم وفن پر حاوی لیکن اپنے آپ سے بیَر
اس کے دل میں آرزوئیں پیدا تو ہوتی ہیں
لیکن پیدا ہوتے ہی گھُٹ کر مر جاتی ہیں
غیرت منداولاد سے اس کا گھر رہتا ہے تہی
اس کے تن میں روحِ مردہ جیسے خاکِ گور
بوڑھے اِس ملت کے شرم وحیا سے عاری ہیں
اور جواں اس کے ہیں تن پرور مانندِ زناں
ان کے دل کی آرزوؤں کو قرار وثبات نہیں
ماؤں کے شکموں سے پیدا ہونے والے مُردے!
بچیاں اس کی، اپنی ہی زلفوں کی ہوئیں اسیر
تہی حیا بھی، خویش نما بھی، اور ہیں خردہ گیر
بنی ٹھنی، ہر وقت رہیں ابرو تلوار کیے
مچھلی، جیسے آب کے اندر، عریاں آئے نظر

ان کی چاندی جیسی کلائیاں عیشِ دید بنیں
ملت راکھ اور راکھ بھی ایسی جس میں شرار نہ ہو
اس کی صبحیں اس کی شاموں سے بڑھ کر تاریک
ہر لمحہ اسبابِ معاش کی فکر میں ہے غلطاں
کھوج میں ساز و ساماں کے اور موت سے ہے ترساں!
اس کے منعم عیش کے پتلے، بخل پہ مائل ہیں
لپک جھپک چھلکوں کی جانب، مغز سے غافل ہیں
حاکم کی قوّت ہے ان کی آقا اور معبود
دین و ایماں کے گھاٹے میں ان کا سود ہی سود
اپنے ''آج'' کی حد سے باہر قدم نہ دھرنے والے
ان کے ہاتھوں سے نہ ڈھلا فردا کا ایک بھی نقش
اپنے پُرکھوں کے سب دفتر بغلوں بیچ دبائے
یہ گفتار کے غازی، عَمَل سے غافل ہائے ہائے
غیروں سے پیمانِ وفا ہے ان کا دین ایمان
حرم کی اینٹوں سے بت خانے کرتے ہیں تعمیر
اے وائے وہ قوم کہ حق سے جس نے منہ موڑا
مر تو چکی ہے لیکن اپنی موت سے ناآگاہ!

❁❁❁

لا الٰہ الّا اللّٰہ

○

ہے مردانِ حال[1] کے باب میں ایک پتے کی بات
بِنا جمال کے قوموں کو ملتا ہے کہاں جلال
لا اور الّا سے ہے عالمِ کاف ونوں کا حساب
لا اور اِلّا سے کُھلتے ہیں بزمِ وجود کے باب
لا اور اِلّا ہے تقدیرِ عالمِ کن فیکوں
لا سے حرکت، اِلّا سے لیتا ہے جنم سکوں!
لا الٰہ کا جب تک ہاتھ میں بھید نہیں آتا
غیر اللّٰہ کے بندھن سے بچنا کارِ دشوار

---

[1] صوفیائے کرام

حرفِ لا سے ہوتا ہے آغازِ کارِ جہاں
یہ ہے مردِ خدا کی منزلِ اوّل [اے انساں]
جو ملت ہوتی ہے اس کے سوز سے بہرہ ور
بارِ دگر پیدا ہوتی ہے اپنی مٹی سے
غیر اللہ کے سامنے ''لا'' کہنے کا نام حیات
کون و مکاں کو اس کے ہنگامے سے ملے ثبات
لا الٰہ کے جنوں سے ہر پیراہن چاک نہیں
اِس شعلے کے لائق ہر خس ہر خاشاک نہیں
زندہ مرد کے دل میں جب یہ جذبہ پیدا ہو
سیکڑوں گم کردہ راہوں کو راہ دکھاتا ہے
گر خواہش ہو بندہ آقا سے ہو گرمِ جدال
''لا'' کے بیج کو اس کی مشتِ خاک کے اندر ڈال
ایسا سوز اور ایسی تپش جس جگر کے اندر ہو
اس کا ہول ہنگامۂ محشر سے بھی بڑھ کر ہو
''لا'' ہے مقامِ ضربِ مسلسل، ضربِ پے در پے
یہ نعمت بجلی کی کڑک ہے، نہیں یہ صوتِ نے
ایسی ضرب کہ ہر موجود کو لا موجود کرے
تا کہ تو گردابِ وجود سے چھٹکارا پائے

اب قصہ تاریخِ عرب کا تمھیں سناتا ہوں
تا کہ اس کے عیب و ہنر کا تم پر راز کُھلے
ریزہ ریزہ ضربِ عرب سے لات منات ہوئے
وہ دنیا میں رہ کر بھی آزادِ جہات ہوئے
ہر دیرینہ پیرہن ان کے ہاتھ سے چاک ہوا
جاہ و جلالِ قیصر و کسریٰ پل میں خاک ہوا
ان کے برق و باراں سے صحراؤں میں ہیجان
ان کے طوفاں سے متلاطم بحر بھی سرتاسر!
ان کی آگ میں عالمِ کہنہ مثلِ خس و خاشاک
یہ سب ہنگامہ تھا ''لا'' کا اس کے سوا کیا تھا؟
اس بت خانۂ محسوسات میں پیہم وقفِ جہاد
تا آنکہ اک عالمِ تازہ و نو کا ہوا ظہور
ان کی سَحَر خیزی کے فیض سے بانگِ حق کا چلن
ان کے بیج کے فیض سے باغ و راغ و سرو و سمن
شمعِ لالۂ مغرب ان کے دم سے ہوئی روشن
ان کے کنارِ جو سے یہ سب ہوئے ہیں گلدامن
لوحِ دل سے نقشِ غیر اللہ کو دھو ڈالا
ان کی خاک سے بیسیوں ہنگاموں کا چلن ہوا

اسی طرح گر غور سے دیکھو عہد فرنگی میں
بندوں نے آقاؤں کے پیراہن چاک کیے[1]
ہو گئے ملکِ روس کے قلب و جگر بھی پیہم خوں
اس کے ضمیر سے صرف اک حرفِ ''لا'' آیا بیروں
اس کے ہاتھوں نظامِ کہنہ ملیامیٹ ہوا
عالم کی رگ پر اس نے کیا تیکھا وار کیا!
میں نے مدارجِ سہ گانہ پر اس کے غور کیا
نے سلطاں، نے گرجا گھر، نے کوئی ذاتِ الٰہ
فکر اس کی ''لا'' کے طوفاں میں محو ہوئی ایسی
اس نے مرکب ''اِلّا'' کی جانب کب دوڑایا
مجھے یقیں ہے زورِ جنوں کے فیض سے وہ اک دن
اس طوفانِ نفی سے خود باہر آ جائے گا
''لا'' کے مقام پہ زندگی کو کب ملتا ہے آرام
کرتا ہے عالمِ موجودات ''اِلّا'' کی سمت خرام
قوموں کا سامانِ سکوں ''لا اور اِلّا'' کے دوار
نفیِ بے اثبات کا حاصل مرگِ بے زنہار

---

[1] اشارہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی طرف (مترجم)

ابراھیم خلیلؑ کا ایماں محکم جبھی ہوا
جب اس کا لا سے اِلّا کی جانب قدم بڑھا
باتیں بنانا چھوڑو اے حجروں کے معتکفو!
نمرودوں کے سامنے نعرۂ ''لا'' کا ورد کرو
یہ عالم بس لہوولعب ہے، ہیچ اس کی وقعت
جان لے لا الٰہ کے جلال کی ارزش اور قیمت
جس کے ہاتھ میں لا الٰہ کی تیغِ برّاں ہو
جملہ موجودات اسی کے تابعِ فرماں ہو

❁❁❁

فقر

○

آب وگل کے غلامو! کُچھ معلوم ہے فقر ہے کیا؟
ایک نگاہِ رہ آگاہ اور ایک دلِ زندہ !
فقر اپنے اعمال کے کارِ میزانی کا نام
باطل معبودوں کی نفی، خالص توحید سے کام
جو کی روٹی کھانا اور پھر خیبر کی تسخیر
جکڑے ہیں فتراک میں اُس کے سلطاں اور امیر
ذوق شوق، تسلیم، رضا سب ایک ہی فقر کے نام
یہ ہے متاعِ دینِ محمدؐ ہم ہیں اس کے امیں

فقر، ملائکِ اعلیٰ پر شبخوں لانے کا عمل
چُھپے ہوئے قدرت کے قویٰ پر شبخوں مارتا ہے
فقر عطا کرتا ہے تجھ کو ایک مقام رفیع
تیرے شیشے کو الماس بنا دیتا ہے یہ
فقر کا سارا ساز و ساماں قرآں کا محتاج
اک گدڑی میں سمائے کیسے مردِ حق آگاہ
جلوت میں وہ بات اگرچہ کم کم کرتا ہے
اس کا ایک سخن
صدہا انجمنوں میں [پل میں] آگ لگا دیتا ہے
بے بال و پر کو ذوقِ پرواز عطا کرتا ہے
مچھر کو شہباز کی تمکیں اور قوّت دیتا ہے
مردِ فقیر شہنشاہوں سے ٹکّر لیتا ہے
اس کے بوریے کی ہیبت سے تخت لرزتا ہے!
اپنے جنوں سے شہر میں ہنگامہ برپا کرتا ہے
جبر اور قہر سے خلق اللہ کو دیتا ہے وہ رہائی
[سچی دارائی!]
وہ صحرا میں اُسی مقام پہ ڈیرا کرتا ہے
جہاں کبوتر کی ہیبت سے شاہیں ڈرتا ہے

جذب وسلوک سے اس کے دل کو حوصلہ ملتا ہے
پیشِ سلطاں نفیِ سلاطیں کا پڑھتا ہے رَجَز
اپنی آگ میں ساری گرمی اس کی خاک سے ہے
شعلہ لرزاں ترساں بس اس کے خاشاک سے ہے
[وہ افلاک سے ہے]

جس ملت میں ایک بھی ہو درویش اگر باقی
ایسی ملت جنگ میں ہرگز مات نہیں کھاتی
اس کے استغنا کے دم سے ہماری عزت ہے
اس کے شوقِ بے پروا سے اپنا سوز گداز
یہ آئینہ سامنے رکھ اور اپنے آپ کو دیکھ
تاکہ تجھ کو فتحِ مبیں کی دولت مل پائے

فقر کی رحمت و رافت ہی سے حکمتِ دیں کا نام
ہر شے سے بے پروائی ہے قوّتِ دیں کا نام

اُس سلطانِ دیںؐ نے مومنوں سے ارشاد کیا
روئے زمیں پورے کا پورا، میری مسجد ہے
گُنہ افلاک کی گردش سے ربِ عالم کی پناہ
غیر کے ہاتھ آجائے گر مومن کی مسجد آہ

نیک نہاد انساں کی جدوجہد کا ایک ہدف
اپنے آقا کی مسجد پھر سے واپس لے لے
ترکِ جہاں کا ہرگز قصد نہ کرنا اے بھائی
ترکِ دنیا بس تسخیرِ عالم کا ہے نام
اس کا راکب ہونا ہی اس سے آزادی ہے
یہی تو آب و گل کے اس بندھن سے رہائی ہے!
مٹی پانی کی یہ دنیا ہے بہرِ تسخیر
کون کہے یہ باز سے، اپنے صید سے تو باز آ
مجھ کو اس الجھن کا کوئی حل نہ ملا اب تک
نُہ افلاک سے شاہیں آخر کیوں کرتا ہے گریز
اس شاہین پہ تُف ہے، جس نے شاہینی کی ترک
کوئی پرندہ اس کے چنگل سے پُر درد نہیں

[بے جاں، سرد نہیں]

اپنے کنج میں سر نہوڑائے گوشہ گیر ہوا
نیلِ فلک میں پر پھیلانا اسے حقیر ہوا
فقرِ قرآنی ہے ہست و بود کی محتسبی
یہ مستی و رقص و سرود و رباب کا نام نہیں
فقرِ مومن تسخیرِ اطراف و جہاتِ حیات

فقر کے دم سے رب کی بندے میں پیدا ہوں صفات
فقرِ کافر ـــــ دشت و صحرا کی خلوت سے عبارت
فقرِ مومن ـــــ بحر و بر میں اک بھونچال کی صورت
اُس کی حیات کو راحت غار و کوہ کی خلوت ہیچ
شانوں والی موت سے ہے تعبیر حیات اِس کی
اُس میں ترکِ بدن سے رب کو ڈھونڈا جاتا ہے
اِس میں خودی کو حق کی سان چڑھایا جاتا ہے
اُس کا کام عبارت خودی کی کُشت وسوخت سے ہے
اِس کا کام خودی کو مثلِ چراغ جلانا ہے!
جب بھی چرخِ بریں کے تلے ہو فقر کا نور ظہور
اس کے شکوہ و خوف سے مہر و ماہ لرزتے ہیں
بدر و حنین کی گرمی فقر کی زندہ مظہر ہے
اسی کی مظہر اور برہاں ـــــ تکبیرِ امام حسینؓ

فقر کا دامن ذوقِ جہاد سے تہی ہوا جس دم
تب سے جلال مسلمانوں کا اک خوابِ برہم

اے وائے ہم، اے وائے یہ کہنہ سال جہاں
تیرے ہاتھ میں تیغِ ''لا'' نے میرے ہاتھ یہ تیغ
جو بھی ناحق ہے تو اس سے لے منہ موڑ جواں!

اس کہنہ بُت خانے سے ہو، پیہم جنگ کناں
دینی غیرت چھوڑ کے کب تک جی سکتا ہے کوئی
اے مومن اس زیست سے تو مر جانا بہتر ہے
مردِ مومن خود کو دوبارہ پیدا کرتا ہے
نورِ حق کے آئینے میں خود کو دیکھتا ہے
نبیؐ کی سیرت کے معیار پہ خود کو کستا ہے
تا آنکہ اک نیا زمانہ پیدا کرتا ہے
اے وائے وہ قوم کہ جس کے پاؤں اکھڑ گئے
پیدا جس نے میر و سلطاں، شاہنشاہ کیے
لیکن اک درویشِ خدارس پیدا کر نہ سکی!
مجھ سے یہ غمناک کہانی بہتر ہے کہ نہ پوچھ
لفظوں میں یہ قصۂ دردافزا سمٹے کیسے؟
میرا گلا رندھا جاتا ہے میرے اشکوں سے
بہتر ہے یہ محشر سینے ہی میں دبا رہے
ہے اس دیس کا مسلم اپنے آپ سے ناامّید
مدت سے دیکھا نہیں اس نے کوئی مردِ خدا
سیدھی بات ہے اب وہ دین کی قوت سے بدظن ہے
اپنے قافلے کا خود اپنے ہی ہاتھوں رہ زن ہے

تین صدی سے یوں تو ہے زندہ ملتِ خوار و زبوں
لیکن باطن یکسر سوز، سرور سے ہے محروم
پستیِ فکر و سفلگیِ دل، ذوق کی بے بصری
مکتب اور ملّا ہیں اس کے، سوزِ دل سے تہی

[وائے بدحالی!]

فکر کی پستی اور زشتی نے اس کو خوار کیا
اس کے نفاق نے خود اس کو خود سے بیزار کیا
اپنے مقام، اپنی منزل سے بے بہرہ ہے وہ
اس کے اندر تبدیلی کی حس کافور ہوئی
مردِ خبیر کی صحبت سے پیہم دوری کے سبب
اس کی طبیعت خستہ، فسردہ، حق سے روگرداں
اپنے مولا کی درگاہ سے دھتکارا، مردود
خود سے بے پروا
مفلس اور قلاش

[گویا زندہ لاش!]

اس کے ہاتھ میں مال کہاں جس کو چھینے سلطاں
اس کے دل میں نور کہاں جو لے بھاگے شیطاں!

اس کا خانقہی مرشد افرنگی کا ہے مرید
اپنے زعم میں حضرتِ بسطامیؒ کا ہے ہم سنگ!

[واہ مولا کے رنگ]

اس کا فتویٰ: دین کی رونق محکومی سے ہے
لطفِ حیات دراصل خودی سے محرومی سے ہے

اس نے غیر کے راج کو رحمت سے تعبیر کیا
گِردِ کلیسا ناچا، موت سے ہم آغوش ہوا

ذوق وشوق وسوز ودرد سے اے مردِ محروم!
دیکھ کہ عصر حاضر نے کیا ہم سے ہاتھ کیا
عصرِ رواں نے ہم کو ہم سے ناآگاہ کیا
راہِ احمدؐ مرسل سے ہم کو بے راہ کیا!
عشقِ محمدؐ جب اُن کے سینوں سے دور ہوا
آئنے سے آئینے کا جوہر کافور ہوا
عصر حاضر کے باطن کو تو نہ سکا پہچان
تو نے پہلے ہی داؤ میں خود کو ہرا ڈالا
عصر رواں کے جال میں تیری فکر ہوئی محبوس
تیرے دل میں آرزوئے زندہ نہ ہوئی بیدار

از خود رفتہ مت ہو، اپنی محتسبی خود کر
اپنے غیر سے اک دو لمحے بیگانہ ہو جا
کب تک خوف و ہراس و وہم کا لقمہ بنے گا تو
اُٹھ، اس دیس میں ہو اپنی حیثیت سے آگاہ
ہیں اس باغ میں اچھی خاصی شاخیں، خوب بلند
نیچی شاخ پہ کر کے بسیرا خود کو خوار نہ کر

[یہ بیوہار نہ کر!]

تو نے گلا ہے نور کا پایا اے مرغِ خوش خُو
اپنی جنس کا عرفاں کر اور اپنی خودی پہچان
زاغوں کا ہم بال نہ ہو اور ان کے ساتھ نہ اُڑ
پہلے خود کو شمشیرِ بُرّاں کی تیزی دے
پھر تقدیر کے ہاتھوں میں تو اپنے آپ کو سونپ
تیرے اندر سیلِ بے زنہار کی لپک جھپک
جس کے آگے کوہِ گراں مانندِ برگِ کاہ!
حرکت کا مرہونِ منت سیل کا جاہ وجلال
اک لمحے کو اس کا رکاؤ موت کا ہم معنیٰ!
نَے ہوں فقیہِ نکتہ ور میں ناہی کوئی ملاّ
فقر و درویشی ہے کیا شے، مجھ کو علم ہے کیا

راہِ دیں میں تیز نگہ ہوں اور عمل میں سست
میرا پختہ خام اور میرا کام ہے بے اتمام
گرچہ حق نے ایک گرہ کھولی سو گرہوں سے!
لیکن اس نے مجھے دلِ مضطر انعام کیا

"میری تڑپ سے اپنا حصہ لے مردِ ہشیار
مجھ سا فقیر نہ پھر آئے گا دنیا میں زنہار"[۱]

❀❀❀

---

[۱] یہ شعر، ازتب وتابم نصیب خود بگیر۔ بعد ازیں نا ید چو من مردِ فقیر کا اردو ترجمہ ہے۔ اقبال نے یہ فارسی شعر واوین میں لکھا ہے۔ شعر کسی اور کا نہیں اقبال ہی کا ہے۔ قبل ازیں مثنوی "مسافر" میں آیا ہے اور "خطاب بہ بادشاہِ اسلام اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ" کے زیرِ عنوان منظومے میں موجود ہے۔ ر۔ک کلیاتِ اقبال (فارسی) صفحات ۸۷۵/۷۹۔

مردِ حُر

○

''خوف نہ کھا''[۱] کے آیۂ حق سے محکم مردِ حر
ہم سر ڈالے میداں میں، سر اُس کا ہتھیلی پر
نورِ لا الٰہ سے مردِ حر کا دل روشن
کب ہے گوارا بندگیِ سلطان و میر اُسے
اُشتر صورت مردِ حر بھی دوش پہ ڈالے بار
دوش پہ ڈالے بار —— کھائے سوکھے خار
اپنے قدم وہ اس محکم انداز سے رکھتا ہے
اس کے سوز سے نبضِ رہ کیا خوب دھڑکتی ہے

۱۔ اشارہ آیت قرآنی لاتخف کی طرف ہے جو قرآن میں متعدد مقامات پر آئی ہے (مترجم)

زندہ تر ہو جاتی ہے اس کے مرنے سے روح!
بانگ تکبیر اس کی حرف و صوت سے مستغنی
جو مُردِ حر راہ کے پتھر کو شیشہ سمجھے
وہ درویش خراج لیا کرتا ہے شاہوں سے!
تیری طبیعت میں ہے حرارت اُسی کی صہبا سے
تیری ندی پروردہ اُسی دریا کے فیض کی ہے
ابریشم کی قباؤں والے ذی شوکت حاکم
خرقہ پوش فقیروں کی ہیبت سے ڈرتے ہیں
دیں کا راز ہے مردِ حر کا عین، ہمارا علم
وہ گھر کے اندر کا بھیدی، ہم بیرونِ در
ہم ہیں کلیسا دوست، مساجد کے سوداگر ہیں
وہ محبوبِ خداؐ کے ہاتھ سے ہے پیمانہ نوش
مے کے بیچنے والوں کا وہ غلام، نہ جام بدست
ہم خالی پیمانوں والے، ہے وہ مست الست[1]
اس کے نم سے پھول کے رخساروں پر سرخی ہے
اس کا دھوٗاں بھی ہماری آتش سے ہے روشن تر

---

[1] اَلَستُ بِرَبِّکُم قالوا بلیٰ کے میثاقِ ازلی کا مے چشیدہ (مترجم)

اُمّتوں کی عظمت کا امینِ راز اس کا سینہ
قوموں کی تقدیر رقم ہے اس کے ماتھے پر
اپنا قبلہ دَیر کبھی اور کبھی کلیسا ہے
اپنی روزی دستِ غیر سے کبھی نہ مانگے وہ
ہم سب افرنگی کے بندے، وہ ہے عبدِ اللہ
کہاں سمائی اُس کی رنگ و بو کی دنیا میں
فکرِ ساز و ساماں میں ہم غلطاں صبح و شام
تلخی ہائے مرگ ہمارا آخر اور انجام !
اِس ہر دم متغیر عالم میں ہے اُسے ثبات
موت اُس کی دانست میں کیا ہے؟ ایک مقامِ حیات
دل والے ہوتے ہیں ہماری صحبت سے بیزار
اُس کے فیض سے ادنیٰ مٹی بن جاتی ہے دل
ہم تخمین وظن کے بندے اسی سے اپنا کام
وہ کم گو لیکن سرتاپا حرکت اور عمل
کوچہ گرد اور فاقہ مست ہیں ہم کم کوش گدا
اس کے فقر کے ہاتھ میں ہے شمشیرِ لا الٰہ
ہم ہیں اسیر بگولوں کے، بے مایہ برگِ کاہ
اُس کی ضرب سے کوہِ گراں سے چشمے پھوٹتے ہیں

اس کا محرم بن اور ہم سے بیگانہ ہو جا
خانہ ویراں بن جا اور صاحب خانہ ہو جا
تو چرخِ دوّار کی گردش کا شکوہ مت کر
زندہ مرد کے فیضِ صُحبت سے بن زندہ مرد
علمِ کتابی سے ہے بڑھ کر صحبتِ مردِ فقیر
مردانِ حر کی صحبت ہوتی ہے آدم گر
مردِ حُر ہے ایک سمندر گہرا، بے پایاں
پرنالے سے مانگ نہ پانی، بحر سے پانی لے
مردِ حُر کا سینہ دیگ کی صورت کھائے جوش
اس کے آگے کوہِ گراں ہے بس اک تودۂ ریگ
روزِ امن میں مرد حر ـــــ محفل کی روحِ رواں
باغ میں فصلِ بہار کے تازہ جھونکے کی مانند
روزِ جنگ میں خود اپنی تقدیر سے واقف مرد
کھودے ہے خود اپنی ہی شمشیر سے اپنی قبر
میں تجھ پر قربان تو مجھ سے تیر کی صورت بھاگ
مردِ حر کا دامن تھام اور بے تابانہ تھام
آب و گل سے دل کا بیج کہاں اگتا ہے بتا
اس کے لیے ہے لازم اہلِ دل کی ایک نگاہ

اس عالم میں تیری ارزش کم تر ہے خس سے
جب تک تو مردِ حر کے دامن سے نہ جُڑ جائے

اسرارِ شریعت

میں نے پیرِ روم سے کتنے ہی سیکھے اسرار
میں نے خود کو اس تحریروں میں پھونک دیا!
[اس نے کہی ہے کتنی سچی دل لگتی یہ بات
اہل دل کے لیے بھیجی ہے کیا عمدہ سوغات]
"گر تو دینِ متیں کی خاطر دولت کرے حصول
تب وہ مال ہے مالِ صالح، ہے یہ قولِ رسولؐ "[1]
گر تو اس حکمت کو نہ سمجھے تجھ پر ہے افسوس
تیرا مال ہے تیرا آقا تو ہے اس کا غلام

---

[1] مال را گر بہر دیں باشی حمول۔ " نِعمَ مَالٌ صالحٌ " گوید رسولؐ (رومی)

سچے تہی دستوں سے قوموں کو ملتا ہے کمال
زر کے پجاری زر والے ہیں وجہِ اصلِ زوال
ایسے منعم کے نزدیک ہے جدت گھٹیا شے
وہ تو صرف اور محض قدامت ہی کا گاہک ہے
اس کی نظر میں برا ہے اچھا، ناصائب صائب
اس کو تغیّر اور تبدّل سے آتا ہے خوف
آقا مزدوروں کا لقمہ چھین کے کرے ہڑپ
ان کی بیٹیوں کے ناموس کا ہے وہ غارت گر
اس کے حضور میں بندہ نَے کی صورت روتا ہے
اس کے لبوں پر آہ وفغاں اور نالے پے در پے
نے اس کے ساغر میں مے ہے نے ہے سبو چے میں
محل بنائے اور خود خوار ہے کوچے کوچے میں
جو درویش صفت منعم ہو کتنا اچھا ہے
بن کے خدا اندیش بہ عہدِ حاضر جیتا ہے
جب تک ''اکلِ حلال'' کے معنی کی تفہیم نہ ہو
ایک آشوب و وبال سے رہتی ہے اُمّت دوچار

''اکلِ حلال'' کے معنی سے یورپ آگاہ نہیں
اسے خبر کیا نُور اللہ سے مومن دیکھتا ہے[۱]
نَے حِلّت نَے حرمت سے ہے اس کو آگاہی
اس کی حکمت خام، ادھورا اس کا کارِ حیات!
غالب قومیں مغلوبوں کا کرتی ہیں استحصال
دانہ یہ بوتی ہیں، حاصل لے اڑتی ہیں وہ
کمزوروں کے منہ کا نوالہ لے اڑنا ''حکمت'' ہے
ان کے تنوں کو جانوں سے خالی کرنا ''حکمت'' ہے!
انسانوں کی تکّہ بوٹی شیوۂ عہدِ جدید
سوداگروں کے بھیس میں ہوتا ہے یہ سارا کھیل!
فکرِ یہود کی عیّاری نے بنک دیے ترتیب
جو نورِ حق لے اڑتے ہیں سینۂ آدم سے
جب تک تلپٹ ہو نہیں جاتا یہ خونخوار نظام
دانش، کلچر، دین، تمدن اک سودائے خام
خیر و شر کی اس دنیا میں ابنِ آدم میں
اپنے نفع و ضرر کے فرق کی آگاہی ناپید

---

۱ اِنَّہٗ ینظُرُ بنورِ اللّٰہِ (حدیث رسولؐ)

اپنے کام کے اچھے برے کے فرق سے ناواقف
اوبڑ کھابڑ اور ہموار کے فرق سے ناآگاہ
نورِ شریعت پھوٹتا ہے دل کی گہرائی سے
اسی سے اس دنیا کے اندھیرے ہوتے ہیں کافور
ہے جو حرامِ شرع اسے دُنیا بھی حرام کہے
تب یہ نظامِ کار چلے گا روزِ قیامت تک!
اے بیٹے یہ کام فقیہوں کا زنہار نہیں
ایسے کام کو ایک نگاہِ دیگر ہے مطلوب
حکم شرع ہے عدل اور ساتھ ہی تسلیم اور رضا
اصل و بنیاد اس کی، ضمیرِ فخرِ دو عالمؐ ہے
فیضِ فراق سے آرزوئیں ہوتی ہیں سینہ تاب
پھر تو کہاں رہے گا، جلوۂ حق ہو کر پیدا
جان لبوں پر آجاتی ہے گرچہ جدائی سے
اس کی رضا کا طالب ہو، تو اس کا وصل نہ چاہ
پیغمبرؐ نے اُس کی رضا کا دیا ہمیں پیغام
اس کے سوا احکامِ شریعت کا نہیں کُچھ مقصود
بوریے کے نیچے پوشیدہ تختِ شہِ جمشید
فقر ہو یا شاہی ہو دونو مظہرِ حرفِ ''رضا''

شاہ کا حکم بجالا اس میں مت کر پیش و پس
روزِ جنگ ہے، نہیں یہ روزِ حرفِ چون و چرا!
جب تک بس میں ہے تو اس کے حکم سے سر مت پھیر
تا کہ مطیع و تابع ہو جائے ہر شخص ترا
فیضِ شرع پیمبرؐ سے تقویم میں ہو احسن
ابراھیمؑ کے ایماں سے لو اپنی کر روشن
اے والا اوصاف! طریقت کا مقصود ہے کیا؟
ہے یہ شریعت کی اپنے باطن میں دید کا نام
تو گر چاہتا ہے اسرارِ دیں کو دیکھے فاش
اپنے ضمیر میں دیکھ اِنھیں، پھر اور کہیں مت دیکھ
دیکھ نہ پائے گر تو، تیرا دیں مجبوری ہے
ایسا دیں تو ذاتِ الٰہی سے مہجوری ہے
بندہ جب تک الحق کو خود فاش نہ دیکھے گا
قیدِ مجبوری مختاری سے کب چھوٹے گا
تو کچھ دیر کو اپنی فطرت میں ہو غوطہ زن
شک اور اندازوں سے نکل اور مردِ حق ہو جا
[ہاں خود میں کھو جا]

تا کہ خوب و زشتِ کار سے ہو جائے آگاہ
ہو معلوم کہ ان اسرار کے نو پردوں میں ہے کیا!
جس خوش بخت کو سرِّ نبیؐ کا حصہ ملتا ہے
وہ خوش طالع جبرائیل کی قربت پاتا ہے
ظاہر میں قرآن کی عظمت پر ہے تو نازاں
کب تک قید رہے گا اپنے حجرے میں ناداں
اُٹھ اور دنیا میں اسرارِ دیں کو روشن کر
اُٹھ اور نکتہ نکتہ شرعِ مبیں کو روشن کر
اس دنیا میں رہے نہ اک دوجے کا کوئی محتاج
شرعِ حضورؐ اکرم کا جوہر یہی نکتہ ہے
مکتب اور ملّا کی سخن سازی کا حاصل کیا
اہلِ ایماں ایک یہی نکتہ نہ سمجھ پائے
قوم تو زندہ تھی اس کو تاویل نے مار دیا
اس کے دل کی آگ، اسی کے دل میں بَرد ہوئی
[یعنی سرد ہوئی]
میں نے کتنے ہی دیکھے ہیں خانقہی صوفی
میں نے شیخِ مکتب کو بھی آنکا پرکھا ہے

میرے عہد میں ایک ''پیمبر'' بھی تو ہوا پیدا
جس نے بجز اپنے، قرآں میں کُچھ بھی نہیں دیکھا!
قرآں اور حدیث میں یوں تو دانا تھے یہ سب
لیکن شرعِ رسولؐ کے باب میں کورے اور کوتاہ
عقل و نقل کی ساری تنگ دو قیدِ ہوا و ہوس
ان کا منبر نان فروشی کا منبر[۱] ہے بس
ایسے کلیم اللہوں سے امیدِ کشود نہیں
''دستِ سفید'' سے عاری ہیں ان سے کُچھ سود نہیں
[ہاں بہبود نہیں]
ایسے میں قوموں کی بگڑی بن سکتی ہے کیا
حق ہے تیرے ہاتھ میں اپنے عمل سے راہ دکھا
[اُٹھ اور جلدی آ]

❀❀❀

---

[۱] وہ چوبی میز جس پر نانبائی روٹی رکھ کر بیچتا ہے۔

ہندیوں کے نفاق پر چند آنسو

○

اے یخ زارِ ہمالہ اے اٹک، اے دریائے گنگ
کب تک عمر بسر کی جائے بے کیف و بے رنگ
پختہ عمر کے لوگ فراست سے بے بہرہ ہیں
سوزِ محبت سے نوخیز جواں یکسر محروم!
شرق و غرب آزاد ہیں لیکن ہم نخچیرِ غیر
اپنے اینٹ اور پتھر ہیں وقفِ تعمیرِ غیر
غیروں کے فرماں کے مطابق گر ہو بسر حیات
گہری نیند نہیں یہ، ہے دراصل دوامی موت

یہ وہ موت نہیں ہے جو اوپر سے آتی ہے
اس کا بیج تو افزائش اندر سے پاتا ہے
ایسے مردے کو نہ قبولے مردہ شُو اور گور
نزد و دور سے فاتحہ خوانی کو آئیں نہ عزیز
اس کے غم میں کسی کا جامہ چاک نہیں ہوتا
اس کا دوزخ آں سوئے افلاک نہیں ہوتا
اس کا فردا اس کے آج میں گم ہے اے وائے
روزِ حشر کی بھیڑ بھاڑ میں مت کر اسے تلاش

[ہے وہ زندہ لاش]

جس نے بیج یہیں پر بویا اور یہیں کاٹا ہے
اس کو پیشِ حق لے جانا گھاٹا ہی گھاٹا ہے!
جس اُمّت نے آرزوؤں کا ڈنک نہیں کھایا
لوحِ جہاں سے فطرت نے نقش اس کا محو کیا
ساحری کی مرہونِ منت سلطانی کی ساکھ
جادوگری سے یہ شیشہ ہے پتھر صورت سخت
اس جادو کے زور نے آخر یہ دن دکھلایا
کافری کفر اور دیں داری دیں سے محروم ہوئی

ہو گئے اہل ہند آپس میں ایسے گریباں گیر
کہنہ فتنے جاگ اٹھے تخریب بنی تعمیر
تب مغرب سے افرنگی نے آن ظہور کیا
کفر و دیں کے اس جھگڑے میں ثالث بن بیٹھا!
کسی کو اب معلوم نہیں ہے فرقِ آب و سراب
ایسے میں لازم ہے پیدا ہو تازہ ہیجان!
جو اس ساری صورتِ حال کو زیر و رُو کر دے
جو اِن اہلِ ہند کے باطن میں بجلی بھر دے!
اے بھائی تو ہر لحظہ ہے مادیت میں گم
حضرتِ حق سے ایک دلِ زندہ کا طالب ہو
دل کا ٹھکانا گرچہ بظاہر آب و گل میں ہے
لیکن نو افلاک اسی کے گرد طواف میں ہیں
ہاں ہشیار، سمجھ مت بیٹھنا یہ دل خاک سے ہے
سچی بات تو یہ ہے رفعتِ نُہ افلاک سے ہے!
یہ دنیا ہے واسطے اس کے منزلِ کوئے دوست
اس کو قبائے لالہ سے ملتی ہے بوئے دوست
وہ ہر آن زمانے سے رہتا ہے جنگ کناں
راہ کے پتھر اس کی ضرب سے ریزہ ریزہ ہاں!

ہے آگاہ وہ منبر سے بھی دار سے بھی آگاہ
اپنے اندر کی آتش کا خود ہی محافظ وہ
ظاہر میں چھوٹی سی ندّی لیکن بحر بہ بر
اس کی موج اسے دیتی ہے طوفانوں کی خبر
ہے وہ زندہ پائندہ بے حاجتِ نان و نمک
لیکن حق کی حضوری سے محرومی اس کی مرگ!
جسم کے خواب کدے کے اندر مثلِ چراغ جلے
خلوت ہو یا جلوت روشن اس کے فیضاں سے
ایسا قلبِ زندہ، مستِ خدا اور خود آگاہ
بے فیضِ فقر و درویشی ہاتھ نہیں آتا!
اے نوخیز جواں تو ایسے دل کے لڑ لگ جا[1]
جی لے آزادی میں، گو کہ غلام ہوا پیدا

❀❀❀

[1] ''لڑ لگنا'' پنجابی محاورہ ہے۔ اردو میں اس کا چلن ہونا چاہیے۔

عہدِ حاضر کا نظامِ سیاست

○

بندِ غلامی پہلے سے بھی سخت ہے جو کرتی
ایسی سیاست کو احرار سمجھتے ہیں اندھی
اہلِ سیاست نے شاہی کا حلیہ بدل دیا
جب لوگوں میں آزادی کا ہنگامہ دیکھا
سلطانی کو لوگوں کی شرکت کا نام دیا
اپنا الّو سیدھا کر کے خام کلام کیا
یہ عیّار سیاست دے آزادی کے پر باندھ
اس کی کلید سے کوئی مقفّل در نہیں کھل سکتا!

اس نے قفس میں قید پرندے کو یہ درس دیا
''دکھی پرندے! گھر میں شکاری کے تو بسیرا کر
دشت و صحرا میں جو نشیمن اپنا بناتا ہے
وہ شاہیں اور شکرے سے محفوظ کہاں رہتا ہے''
مرغِ زیرک اس کے سحر سے دانہ مست ہوا
اُس کے آزادی کے نغمے پھنس گئے گلے کے بیچ
تو ہے گر آزادی کا خواہاں، اس کے جال سے بچ
پیاسا مرجا لیکن اس انگور کی بیل سے بچ
تو اس کی گفتار کی گرمی کے دھوکے میں نہ آ
حرفِ پہلودار سے اس کے کبھی فریب نہ کھا
اُس کے سرمے سے بہتر ہے آنکھ رہے بے نور
اُس سے انساں اور بھی بڑھ کر ہوتا ہے مجبور
اس کی صراحی کی مے سے پرہیز ضروری ہے
اس کے قمارِ بیہودہ سے لازم دوری ہے!
اپنی خودی سے مردِ حر غافل نہیں رہتا ہے
اس کی افیوں کی گولی سے خود کو رکھ محفوظ
فرعونوں کے سامنے جرأت سے کہہ حرفِ کلیم
تا کہ تیری ضرب سے ہو بحرِ موّاج دو نیم

میں اس قوم کی حالت دیکھ کے افسردہ پیکر
اس کے رہبر کا دل نورِ جاں سے تہی یکسر
تن پرور کوتاہ نظر اور جاہ پرست بھی ہے
اس کا باطن نورِ لا اِلہٰ سے خالی ہے
جنم حرم میں لے کر بھی وہ مُرید کلیسا ہے
ناموسِ اسلام کو اس نے پارہ پار کیا!
اس کی طرف متوجّہ ہونا نااندیشی ہے
اس کا سینہ، روشن قلب سے یکسر خالی ہے
اس رستے میں صرف اپنے پر تکیہ کرا ے یار
اندھے سگ کے ساتھ کیا ہے کس نے ہرن شکار؟
تف اس قوم پہ جس نے خود سے آنکھیں کر لیں بند
خود سے رشتہ توڑ کے غیر اللہ سے جوڑا دل
جب ملت کے دل میں خود آ گاہی کی موت ہوئی
بنا پہاڑ اک گھاس کا تنکا، رزقِ بادِ ہُوا
لا الہٰ کا دفینہ اگر چہ دل میں رکھتا ہے
اس کے بطون سے جنم لیا کب مردِ مسلماں نے؟
ایسا مسلماں جو محرومِ یقیں کو یقیں بخشے!
جس کے اک سجدے سے دھرتی تھر تھر کانپے

جو شمشیر تلے بھی لا الٰہ کا وِرد کرے
جس کی کشتِ خوں سے لا الٰہ کا پھول کھلے!
نے وہ سرور رہا اب نے وہ باقی مشتاقی
ایک بھی صاحب دل کعبے کے بیچ نہیں باقی!
اس کہنہ دھرتی کے اندر اے مردِ اسلام
کب تک بنا رہے گا باطل معبودوں کا غلام
ایسی جہد کہ جس میں توفیق ولذت ہو مانگ
نالۂ نیم شبی سے ہی یہ نعمت ممکن ہے
بیچ سمندر خار وخس کی صورت جینا کیا
ضبطِ نَفَس سے کوہ کی صورت مستحکم ہو جا
گرچہ دانا کسی سے اپنا حالِ دل نہ کہے
لیکن تجھ سے اپنے دل کا درد چھپے کیسے
چونکہ غلام ہوں اور غلامی ہی میں ہوا پیدا
اس لیے میں کعبے کی چوکھٹ سے جا دور پڑا
جب بھی حضور پاکؐ کی ذات پہ بھیجوں حرفِ درود
شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے میرا وجود
عشق مجھے دیتا ہے طعنہ ''اے محکومِ غیر
تیرا سینہ بھرا بتوں سے ہے مانندِ دیر

تو ہے چونکہ پاک نبیؐ کے رنگ و بو سے دُور
اپنے درود سے میلا مت کر نامِ پاکِ حضورؐ

پوچھ نہ مجھ سے، میرا قیام بغیر حضوری ہے
پوچھ نہ مجھ سے، سجود مرا لذت سے دوری ہے
جلوۂ حق، گو ظاہر اک دم کے لیے ہوتا ہے
لیکن یہ مردانِ حق کی خاطر ہوتا ہے
اک مرد آزاد جونہی سجدے میں سر رکھتا ہے
نیلا انبر اس کے طواف میں گرداں ہو جاتا ہے
ہم ہیں غلام سو اس کے جلال سے ہم آگاہ نہیں
اس کے سدا بہار جمال سے ہم آگاہ نہیں
جو ہو غلام سو اُس میں لذتِ ایمانی مت ڈھونڈ
ہو وہ اگرچہ حافظِ قرآں، فرقانی مت ڈھونڈ
ہے وہ اگرچہ مومن لیکن آزر پیشہ ہے
اس کا دین اور اس کا عرفاں کافر پیشہ ہے
گر باقی ہے تیرے بدن میں درد و سوزِ حیات
مومن کی معراج کا مطلب صرف اور صرف صلوٰت

لیکن جسم اگر ایماں کی گرمی سے ہے تہی
تیرا سجدہ رسمِ کہن ہے اور نہیں کُچھ بھی

ملک و دیں کی شان و شوکت ـــــ آزادوں کی عید
صرف ہجوم ایماں والوں کا ـــــ محکوموں کی عید

❁❁❁

اُمّتِ عربیہ سے چند باتیں

○

اے عَرَبی اُمّت ہو تیرے دشت و در کی خیر
کس نے کی لا قیصر و کسریٰ[1] کی آواز بلند؟
اس دنیائے نزد و دور و دیر و زود کے بیچ
کون تھا پہلا قرآں خوانی کرنے والا، کہہ؟
کس کو سکھائی گئی یہ بتلا رمزِ الا اللہ ؟
پہلی بار چراغ کہاں یہ روشن کیا گیا؟

---

[1] مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قیصر ہلاک ہوا، اب اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

علم و حکمت کس خوانِ نعمت کا تھا ریزہ ؟
آیۂ اصبحتم[۱] کس قوم کی شان میں تھا آیا؟
اک امیؐ کے فیضِ نظر نے معجزہ دکھلایا
پل میں چٹیل ریگِ عرب کو لالہ زار کیا
آزادی کا تصور اُسؐ کی گود میں پلا بڑھا
قوموں کا امروز اُسی کے کل کا زائیدہ!
اُسؐ نے آدم کے سینے کو دل سی نعمت دی
اسؐ نے ہٹائی آدم کے چہرے سے دبیز نقاب
سب کہنہ مغرور خداوندوں کے توڑے بت
اسؐ کے نم سے ہر کہنہ ٹہنی پر پھول کھلے
اس کے نَفَس کی گرمی سے ہنگامۂ بدر و حنین
صدیقؓ و فاروقؓ و حیدرؓ اور امام حسینؓ
جنگ کی ہاو ہو کے اندر سطوتِ بانگِ صلوٰت
عینِ جنگ کے ہنگامے میں قرأتِ صٰفّٰت
تیغِ صلاح الدین ایوّبی، نگہِ بسطامیؒ
دونو جہاں کے گنجینوں کی شاہ کلید بنی!

---

[۱] آیۂ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے،
(آل عمران) ۳:۱۰۳

موجبِ سرشاریِ عقل و دل اک جامِ مے
اک وحدت میں ڈھل گئے ذکر و فکرِ روم و رے[۱]
علم و حکمت، دین و شریعت، نظمِ امورِ زیست
دل تھے سینوں کے اندر بے چین برائے علم
تاج محل اور الحمرا کا حسنِ عالم سوز
قدّوسیوں سے بھی جو لے لیتا ہے باج خراج
یہ سب اس کے اوقاتِ بے مثل کا اک لحظہ
یہ سب اس کی تجلّیاتِ فیض کا اک جلوہ
یہ سب مذکورہ جلوے تو ظاہر ہیں اسؐ کا
اسؐ کا نورِ باطن عارفوں سے بھی پوشیدہ!

کرتا ہوں بے حد توصیف رسولِ رحمتؐ کی
مشتِ خاک کو جس نے ایماں کی نعمت بخشی[۲]

حق نے تجھے شمشیر سے بھی بُرّش میں تیز کیا
اُشتر بانوں کو تقدیر کا راکب کر ڈالا
بانگِ صلوٰۃ و تکبیر و کشتار و حرب و ضرب
ان ہنگاموں سے ہوئی ممکن وسعتِ شرق و غرب

۱۔ یعنی حضرتِ جلال الدین رومی اور امام فخر الدین رازی

۲۔ یہ شیخ عطار کے ایک شعر (بہ ادنیٰ تصّرف) کا ترجمہ ہے۔

خوشا تمھاری وہ مجذوبی وہ محبوبیت
وائے تمھاری یہ دلگیری، غمناکی، ذلّت
دیگر قومیں راہِ علم و کشف میں طاق ہوئیں
اپنے صحرا کی ارزش سے تو بے علم ہوا
تو اک اُمتِ واحد تھا، ٹکڑوں میں ہوا تقسیم
اپنی محفل اپنے ہاتھوں تو نے کی برہم
خودی کے بند سے آزادی دراصل ہلاکت ہے
بیگانوں سے ہم رنگی دراصل ہلاکت ہے
تو نے خود پر ڈھایا ہے جو ظلم مثالی ہے
روحِ پاکِ حضورِ اکرمؐ بڑے ملال میں ہے
تو افرنگی کے جادو سے کُچھ آگاہ نہیں
اس کے چُھپے ہوئے فتنوں کی نہیں خبر تجھ کو
ہے مطلوب نجات تجھے گر اس کے افسوں سے
اس کے اونٹ بھگا دے اپنے حوضوں، چشموں سے
اس کی عیّاری نے بے بس کر ڈالی ہر قوم
عربوں کی وحدت کو اس نے پارہ پارہ کیا
[تار و تار کیا]

دامِ فریبِ افرنگی میں جب سے عرب پھنسا
اس کو فلک نے دی نہیں اک لمحے کے لیے امان
اپنے عصر کو غور سے پڑھ رکھتا ہے آنکھ اگر
روحِ عمرؓ کو اپنے جسم و جاں میں زندہ کر
دینِ مبیں کی، وحدت و جمعیت سے قوت ہے
دیں دراصل یقیں، اخلاص ہے، ہمہ عزیمت ہے
فطرت کے اسرار سے مردِ صحرا ہے آگاہ
وہی جو اِن سے واقف ہے وہ حافظِ فطرت ہے
سادہ فطرت لیکن زشت وخوب کا ہے پارکھ
لاتعداد ستارے اُس سورج کے آگے ماند
دشت و در اور کوہ و دمن کی حد سے باہر آ
اپنے باطن، اپنے وجود میں خیمہ زن ہو جا
[صاحبِ فن ہو جا]
طبع کو اپنی، تیزی دے کر بادِ صحرا سے
عرصۂ جنگ کی جانب اپنی ناقہ کا منہ موڑ
فیض اندوز ہے عصرِ حاضر تیرے زمانے سے
اس کی ساری مستی ہے تیرے پیمانے سے

تو ہی اس کے سب اسرار و رموز کا شارح تھا
تو ہی تھا پہلا معمار اِس عصرِ حاضر کا
جب افرنگ نے اس نوخیز کو فرزندی میں لیا
تب سے بے ناموس و حیا یہ شاہدِ شوخ ہوا
ظاہر میں گو یہ محبوب ہے شہد سے بھی میٹھا
لیکن ہے دراصل یہ کج رو دین سے بے بہرہ
تو اس خام کو پختہ تر کر دے مردِ صحرا!
اپنی کسوٹی پر عصرِ حاضر کو جانچ ذرا!

❁❁❁

اب کیا کرنا چاہیے اے اقوامِ شرق

○

افرنگی کے ہاتھوں نوعِ انساں کرب میں ہے
اور حیات کے ہنگاموں کی دنیا سرد، خنک
اب کیا کرنا چاہیے اے اقوام شرق؟
مشرق کے دن پھر سے کچھ کچھ روشن ہیں
اس کے باطن میں اک تازہ طوفاں
انگڑائی لے کر جاگا ہے
رات گئی، خورشیدِ خاور اپنی کرنوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ
صبح کے تخت پہ آن براجا ہے

یورپ خود اپنی شمشیر سے گھائل ہے
اس نیلے آکاش کے نیچے اس نے لادینی کی رسمِ تیرہ کی بنیاد رکھی
اس عیّار کو پہچانو
برّۂ سادہ لوح کے بھیس میں ظالم گرگ ہے یہ
ہر لحظہ اپنے نخچیر کی گھات میں ہے
اس کی نظر میں آدم بس آمیزۂ آب و گل
اور حیات، جہات سے عاری، بے میل و منزل
ہر شے جو بھی نظر آتی ہے، حق سے منور ہے
جو دیکھے آیاتِ خدا کو حُر کہلاتا ہے
اشیاء کی حکمت بھی ہے اسرارِ الٰہی میں سے
اس حکمت کے پیچھے اصل میں حکمِ ''اُنظُر''[1] ہے
علم کے نور سے جب اس مردِ حُر کے باطن میں
بجلی کوندتی ہے
اس کا دل اللہ سے ڈرنے لگتا ہے

---

[1] ''قرآن کی ایک آیت ہے: افلاینظرون الی الابل کیف خلقت ۔۔۔۔۔الخ (سورۂ الغاشیہ)
اقبال نے اُنظُر کی توضیح میں'' فانظر الی الابل'' ۔۔۔۔لکھ کر اسے قرآنی تلمیح کہا ہے۔ اصل آیت میں افلاینظرون آتا ہے۔ ہاں تفکر اور تدبر کے ضمن میں قرآنِ حکیم میں دسیوں مقامات پر ''اُنظُر'' کی عبارات آئی ہیں مگر ان میں کہیں وہ عبارت موجود نہیں جو اقبال نے ''پس چہ باید کرد'' کے حاشیے میں بہ ایں الفاظ نقل کی ہے: فانظُر الی الابل کیف خُلِقَت (مترجم)

علمِ اشیاء خاک کو کیا اکسیر بناتا ہے!
لیکن اس کا رنگ جدا تہذیبِ غرب میں ہے
خوب و زِشت سے اُس تہذیب کی عقل و فکر تہی
آنکھ اس کی بے نم ہے، دل پتھر کی صورت سخت
شہر و دشت میں ہر جا علم اس کے ہاتھوں رُسوا
جبرائیل بھی اس کی صحبت میں ابلیس ہُوا!
دستِ دانشِ افرنگی میں ایک اُپی تلوار
نوعِ بشر کے قتل و سلب کو ہر لحظہ تیار
تف افرنگ پہ، تف اس کے آئین پہ ہے
افسوس اس کی فرہنگِ لادین پہ ہے
[اس کے کالے کرتوتوں کو دیکھو تو]
علمِ حق کو سحر سکھایا، بلکہ کفر سکھایا
اس کے فتنوں کے لاؤ لشکر نے
بے بس نوعِ انسانی کو گھیر رکھا ہے
اے اقوامِ شرق اُٹھو!
اور اس تہذیبِ لادینی کے
سحر کے تار و پود بکھیرو
[اس کو گھیرو]

اس کے تن میں پھر سے روحِ مشرق جاری کر دو
جس سے قفلِ معنی کو مفتاح میسر آئے
عقل فقط دل کے قبلے میں یزدانی ہوتی ہے
اس سے قطع تعلق کر کے شیطانی ہوتی ہے

ہر لحظہ ہر لمحہ ایک نیا ہنگامہ ہے
حبشہ کا احوال بھی تازہ عبرت نامہ ہے
یورپ کے اندھے فتوے کی رُو سے
گرگوں پر برّے کا خون حلال

[اے وائے دجّال!]

اس دنیا میں نقشِ تازہ کی بنیاد رکھو
مغرب کے دزدانِ کفن سے کیا اُمیّدِ کشاد
یہ جو علم بردارِ امن و سکون جنیوا ہے
یہ تو مکر و فن ہے سراپا
تو بھی اس کا صید ہے، میں بھی ہوں نخچیر اسی کا
قصہ کوتہ

ایک جہاں ان کے ہاتھوں آشوب و ہلاکت میں
آؤ! عالم کو پیغامِ امن و سکینت دیں

[اے مشرق کے باسی اب تُو گوشِ ہوش سے سُن]
رنگ و نسل کے کالے دیو سے ہو آزاد
افرنگی کا کافر، اپنا مومن بن!
سود و زیاں کے سارے رشتے تیرے ہاتھوں میں
مشرق کا ناموس بھی تیرے دم سے ہے
ان کہنہ اقوام کو پھر سے اک مرکز پر لا
صدق و صفا و سوز و صداقت کا پرچم لہرا
اہلِ حق کی حیات ہمیشہ سے قوت سے ہے
اور ملت کی قوت؟ [سو وہ] جمعیت سے ہے
عقل و فکر جو بے قوّت ہو مکر و فسوں ہے بس
قوّت جو بے عقل و خرد ہو، جہل و جنوں ہے بس
یہ جو متاعِ سوز و ساز و درد و داغ و خلش ہے
یہ جو شراب ہے، یہ جو ایاغ ہے، مشرق کی بخشش ہے
عشق کو ہم نے دل لے جانے کا فن سکھلایا تھا
مٹی کیسے انساں بنتی ہے، بتلایا تھا
خواہ ہنر ہو خواہ ہو دیں دونو مشرق کی دین
پاک زمیں مشرق کی، باعثِ رشکِ گردوں ہے

جو کچھ تھا، اسرار کے پردوں میں پنہاں دکھلایا
ہم سے سورج، ہم سورج سے!
یہ تھا ہمارا ابرِ نیساں، جس نے صدف کو گوہر بخشا
ہر ساگر کو شوکت و شورش اپنے ہی طوفاں سے ملی ہے
سوز و گدازِ بلبل میں اپنی ہی رُوح نمایاں
آدم کے لوہو کی روانی پھول کی رگ میں
ہم نے ہی دیکھی ہے
یہ جو ہیں اسرارِ وجودی ان کے کھوج میں اپنی فکر نے
تارِ وجود پہ پہلی ضرب لگائی
اپنے اندر داغِ عشق جو ہم رکھتے تھے
اس کو ہم نے چراغ کی صورت برسرِ راہے رکھا
اے فرزندِ شرق، امینِ دین وتمدن اُٹھ
اس ظلماتِ غرب کی تہ در تہ گھنگھور گھٹا کے مقابل
اپنا روشن، نور کا قاسم ہاتھ نکال
اے آدم کی ڈھال
افرنگی تہذیب کا نشّہ اپنے سر سے نکال
قوموں کی گنجلک گرہوں کو کھول
[اے بیٹے، اے نور مری آنکھوں کے، کچھ تو بول!]

[لازم ہے تُو] مشرق کی وحدت کی ڈال بنا
دستِ اہریمن سے یکسر اپنا آپ چھڑا
تو افرنگی اور اس کے کرتوتوں سے واقف ہے
پھر یہ قیدِ فرنگ کہاں تک؟
یہ ظالم افرنگی ہمارے وجود پہ نشتر زن ہے
زخم زخم ہے، لہولہو ہے اپنا بھیتر باہر
اے وائے! امیدِ رفو بھی اسی سے ہم نے لگائی
[ہائے نابینائی]
تو واقف ہے
شاہ جو ہوتا ہے وہ قاہر ہوتا ہے
اور عہدِ موجود میں قاہر ہونا سوداگر ہونا ہے
تخت و تاج میں حصہ دار ہے اب دکّان کا تختہ!
یہ افرنگی حاکم بھی تو اصل میں سوداگر ہے
اس کی زباں پہ خیر کا کلمہ اور پہلو میں شر ہے
گر تو نگاہِ ہوش سے دیکھے، آئے تجھ کو نظر
اس کے حریر سے نرم و نازک تر تیرا کھدّر
تو اس کے بازار سے مثلِ موجِ نسیم گزر
اس کے لباسِ گرم سے ٹھنڈی موت کہیں بہتر

قتل کرے ہے بے حرب و بے ضرب و بے ساطور
اس کی مشینوں کی گردش میں موت کا پھنکتا صور
تو اس کے قالین کے بدلے
اپنی چٹائی — اپنی میلی اور گِل خوردہ
سیلن زدہ چٹائی کا سودا مت کر
اپنا پیادہ اس کے فرزیں کے بدلے میں نہ دے
عیب دار ہے اس کا گوہر، لعل اس کا ناقص ہے
اس کی کستوری کا نہ پوچھو — نافِ سگ کی عفونت
تو نے خود اپنے کام میں سوسو گرہیں ڈالی ہیں
ہرگز اس کے ریشم سے نہ بنا اپنی دستار
اس کی مخمل پر ہوتے ہیں سارے خواب حرام
اس کے مے خانے میں مر جاتے ہیں مے آشام
سودا کرتے وقت یہ کم آواز و خندہ لب
ہم احمق بچے وہ شاطر تاجر شیرینی کا
یہ مغرب کے تاجر یہ مغرب کے سوداگر
اپنے گاہک کی نظروں اور دل کے بڑے محرم ہیں
ان کو سوداگر نہ کہو یہ اصل میں ساحر ہیں

یہ رنگ وخوشبو کے تاجر سب کچھ لے بھاگے ہیں
ہم گاہک، ہم بے چارے بس اندھے دُھندے ہیں
اے فرزندِ مشرق، مردِ حُر، مردِ آزاد
جو کچھ تیری خاک سے اُگتا ہے
اسی کو کھا اور وہی پہن اور اسی کو بیچ
[اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بس ہیچ ہی ہیچ]
وہ جو آنکھیں رکھتے ہیں، اپنے محرم ہیں
اپنی گدڑی خود سیتے ہیں
اے عصرِ حاضر سے آنکھیں موندنے والے
آنکھیں کھول اور یورپ کی عیاری دیکھ
تیری آنکھ میں دھول جھونک کے تیرے ہی ریشم سے
یہ قالین بنائے
اس کی ایک جھلک دکھلا کر پھر یہ تجھ کو لبھائے
تیری بھولی آنکھ پہ جادو اس کا بولتا ہے سر چڑھ کر
اس کی چمک دمک کا سیلِ بے پایاں
تنکے کی صورت میں تجھے بہالے جاتا ہے
تف ہے اس دریا پر جس میں موجیں مار نہیں کرتی ہیں
اور جو غواصوں کے ہاتھوں

اپنے ہی موتی کا خود گاہک بنتا ہے
[اب کیا کرنا چاہیے اے اقوامِ شرق؟
کچھ تو سوچیں
کچھ تو بولیں
اب کیا کرنا چاہیے اے اقوامِ شرق؟]

حضورِ رسالت مآبؐ میں

(۳؍اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کہ میں دارالاقبال بھوپال میں تھا، سید احمد خاںؒ خواب میں آئے اور فرمایا کہ حضورِ رسالت مآبؐ میں اپنی علالت کے ضمن میں عرض کر)

○

ہم بیچاروں کا سرمایہ صرف اک آپؐ کی ذات
آپؐ اِس قوم کو کر دیجے آزادِ خوفِ ممات
آپؐ نے لات و مناتِ فرسودہ کو راکھ کیا
کہنہ بزمِ جہاں کو آپؐ نے تازہ رنگ دیا
مابینِ دُنیائے ذکر و فکرِ انس و جاں
آپؐ صلوٰۃِ صبح بھی ہیں اور آپؐ آوازِ اذاں
سوز و سرور کی ساری لذت لَا اِلٰہ سے ہے
اندیشوں کی رات میں جرأت لَا اِلٰہ سے ہے
رب کا رتبہ ہم نے گاو و خر کو نہیں دیا
ہم نے کاہنوں کے آگے سر کبھی نہیں ڈالا

کہنہ معبودوں کے آگے سجدہ ریز نہ تھے
میر و سلطاں کی کوشک کے نہیں لیے پھیرے!
آپؐ کے لطف بے پایاں سے ممکن ہوا یہ سب
فکر ہماری آپؐ کے احساں کی پروردہ ہے
آپؐ کا ذکرِ اقدس ہے سرمایۂ ذوق و سرور
قوم کو یہ رکھتا ہے فقیری میں بھی بڑا غیور
ہر راہی کے آپؐ مقام اور آپؐ ہوئے منزل
ہر رہرو کے دل میں آپؐ کا ہی جذبِ کامل
آہ ہمارا ساز کُچھ ایسا بے آواز ہوا
اس کے تاروں پر مضراب کا بوجھ گراں ٹھہرا!
سیرِ عجم بھی میں نے کی اور سیرِ عرب بھی کی
ابولَہَب ارزاں تھا، حضرتؐ کی نایابی تھی!
یہ جو مسلماں زادہ ہے ظاہر میں روشن فکر
ہے فی الاصل ضمیر اس کا، گھر ظلمت کا، بے نور

[سوز و سرور سے دور]

عہد جوانی میں نازک اندام حریر مثال
آرزوئیں اس کے سینے میں مرجاتی ہیں جلد

مدت سے وہ چلا آتا ہے نسل بہ نسل غلام
اس کی فکرِ غلامانہ میں حریّت ہے حرام!
اس میں دین کا جذبہ مکتب نے نابود کیا
تھا جو وجودِ زندہ اس کو ناموجود کیا!
اب یہ خود سے بیگانہ اور مستِ فرنگ ہوا
جو کی روٹی کا خواہاں ازدستِ فرنگ ہوا
فاقہ کش نے جان کے بدلے نان خرید لیا
آہ اس دکھ نے میری آنکھوں کو خونبار کیا!
مرغِ سرا کی صورت دانہ دُنکا چگتا ہے
نیلے انبر کی پہنائی سے بے بہرہ ہے
شیخِ مکتب جو خود جاہل اور کم بیں ٹھہرا
وہ شاگرد کے علم و خرد کو کیا بخشے گا جلا؟
افرنگی کی آگ نے اس کو راکھ کیا یکسر
یعنی اس دوزخ نے اس کی کردی کایا کلپ
گو مومن ہے لیکن رمزِ مرگ سے کم آگاہ
رکھتا نہیں کچھ ادراکِ لَاغَالِبَ اِلَّا اللہ[1]

---

[1] اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں

جب سے ہوئی اس کے سینے کے اندر دل کی موت
اس کو سوجھتا کچھ نہیں سونے اور کھانے کے سوا!
''ہاں'' اور ''نہ'' کے نشتر سہتا ہے بہرِ یک نان!
ایک شکم کی خاطر سَو کا مرہونِ احسان
افرنگی سے کرتا ہے یہ لات و منات خرید
مومن ہے اور سومنات کی اس کو خواہشِ دید!
''میرے حکم سے اُٹھ[۱]'' فرمائیں، اس کو کریں حیات
اس کے دل کو زندہ کر دیں اللہ ھُو کے سات!
ہم سب پر حاوی ہے تہذیبِ مغرب کا سحر
بے حرب و بے ضَرب ہیں افرنگی کے آگے ڈھیر!
آپؑ اِس قوم میں جس کے جام و مینا ہوئے شکست
کر دیں اپنے فیض سے ظاہر بندۂ مولا مست
''تاکہ مسلماں کو پھر سے اپنا عرفان ملے
پھر سے اس دنیا کے بیچ اسے پہچان ملے''
شاہ سوارِ اعلیٰؑ اک دم کو روکیں مرکب
میری زباں پر آ نہیں پاتا ہے دل کا مطلب

۱؎ قم باذنی

میرے دل کی امنگ آئے یا آئے نہیں بر لَب؟
شوقِ بے حد پابندِ رسمِ آداب ہے کب!
شوق یہ کہتا ہے دکھیارے! کھول اپنے لب کھول
ادب مجھے کہتا ہے آنکھیں کھول اور لب کر بند!
جملہ حریمِ کون و مکاں پھرتی ہے آپؐ کے گرد
آپؐ کی ایک نگاہِ گرم کا میں متمنّی ہوں
میرا ذکر و فکر و علم و عرفاں آپ حضورؐ!
میری کشتی، میرا بحر اور طوفاں آپ حضورؐ
میں اک آہو جو ہے زار و زبون، تھکا ماندہ
کسی نے بھی گرہِ فتراک میں اسے نہیں باندھا
آپؐ کا کوچۂ اقدس میرا مامن اور ملجا
اک اُمید لگائے آپؐ کی جانب میں لپکا
سینے میں فریاد کو کب تک پنہاں رکھوں میں
سانس کے زور سے سو غنچوں کو کیسے کِھلاؤں میں
میرا نغمہ آہ مرے ہی گلے میں ٹُوٹ چلا!
اک شعلہ بھی مرے سینے سے ظاہر نہیں ہوا

میرے نَفَس میں میرے جگر کا سوز نہیں باقی
وہ لطف قرآنِ سحر ہر روز، نہیں باقی ۱؎
میری آہ وزاری کب اس دل سے سنبھلتی ہے
کب تک میرے سینے کے اندر یہ قید رہے!

میرے نالے کو درکار ہے لا محدود فضا
نو افلاک کی وسعت و پہنائی اس کی منشا

کیا ہو بیاں اس درد کا جو میرے تن و جاں میں ہے
آپؐ کا گوشۂ چشم ہی میرا دارو، درماں ہے
میری جانِ زار کو تلخ دوائیں راس نہیں
میرے مشامِ جاں کو گوارا ان کی باس نہیں
ایسی دوائیں مجھ بیمار کو اچھا کریں گی کیا
ایسی دوائیں مجھے رلاتی ہیں بچوں کی طرح
دیتا ہوں میں فریب اِن کی تلخی کو میٹھے سے
میرا معالج اس معصوم ادا پر ہنستا ہے

۱؎ اشارہ اپنے گلے کی بیماری کی طرف ہے جس کے باعث آواز شدید طور پر بیٹھ گئی تھی۔ اقبال کی زندگی کے آخری تین برس اسی آشوب میں گزرے (مترجم)

میں بھی بُصیری ہی کی طرح طالب ہوں گشایش کا[1]
تاکہ میں بھی ہو جاؤں فی الواقع پہلے سا!
آپؐ کی رحمت وشفقت عاصیوں پر افزوں تر ہے
آپؐ کی مہر خطا کاروں کو صورتِ مادر ہے
میں ہوں پرستارانِ شب سے محوِ جدو جہاد
روغن ڈال کے میرے چراغ کو جیتی جان کریں
[یہ احسان کریں]
آپؐ کی ذاتِ پاک جہاں کے لیے بہارِ نو
مجھ سے دریغ نہ فرمایئے گا اپنا پرتو
''روح سے تن کی قدر ہے خوب یہ آپؐ کے علم میں ہے
روح کی قدر ہوا کرتی ہے پرتوِ جاناں سے''[2]
غیر اللہ سے میں کوئی امید نہیں رکھتا
آپؐ مجھے شمشیر بنادیں یا کر دیں مفتاح

---

[1] بصیریؒ: مشہور عربی قصیدۂ بردہ کا مصنف۔ یہ قصیدہ حضور رسالت مآبؐ کی نعت میں ہے۔ روایت ہے کہ بصیریؒ کا قصیدہ بارگاہِ نبویؐ میں مقبول ہوا اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی (اقبال)

[2] یہ رومی کے شعر کا ترجمہ ہے جس کا اقبال نے حوالہ دیا ہے، شعر یہ ہے:
خود بدانی قدرِ تن از جاں بُود
قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بُود

گرچہ میری فکر ہے فہمِ دیں میں بہت ہشیار
میری خاک سے پھوٹ نہ پایا اک تخمِ کردار!
میرے تیشے کو فرما دیں ذرا زیادہ تیز
ہوں فرہاد سے کہیں زیادہ مشکل سے دوچار
[آپؐ مرے غم خوار]

میں مومن ہوں اپنی ذات کا منکر نہیں ہوں میں
آپؐ چڑھائیں سان مجھے، بدگوہر نہیں ہوں میں

گرچہ میری عمر کی کھیتی رہی ہے بے حاصل
سینے میں اک شے ہے حقیر سی جس کا نام ہے دل!
چشمِ جہاں سے اس کو میں رکھتا ہوں پوشیدہ
کیونکہ اس پہ اسپِ نبیؐ کے سُم کا ہے نقش بنا
مجھ عاجز کو ساز و ساماں سے کچھ کام نہیں
مگر بغیرِ حضوری میری زیست مثالِ مرگ!
کُرد کو آپؐ کے دستِ غیب نے بخشا سوزِ عرب[1]
مجھ عاجز کو بھی آپؐ سے پہنچے اک فرمانِ طلب

---

[1] اشارہ ہے مشہور قول اَمسَیتُ کردیّاً اَصبَحتُ عربیاً کی طرف، جس کا مفہوم یہ ہے:

"میں نے رات کُرد کے طور پر گزاری، عرب کے طور پر صبح کی"

روایت ہے کہ ایک بزرگ تھے کرد۔ زبانِ عربی سے بالکل ناواقف۔ انھیں ایک شب احساس ہوا کہ کیسی محرومی ہے کہ ایک طرف حضور اکرمؐ سے دعوائے محبت اور دوسری طرف ان کی زبان (عربی) سے ناآشنائی! اسی احساسِ محرومی کے ساتھ سو گئے۔ صبح بیدار ہوئے تو بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے لگے۔ انھی کا قول اَمسَیتُ کُردیاً...... الخ، اوپر درج ہوا۔ (مترجم)

میں وہ غلام کہ جس کا مثالِ لالہ، دل ہے داغ
جس کے یاروں کو نہیں مطلق اس کے غم کا سراغ
ایسا غلام کہ اس دنیا میں گریاں مثلِ نے
اس کے سوختہ دل سے نغمے ابھریں پے در پے
ادھ جلی لکڑی کی صورت صحرا کے بیچ گرا
قافلہ کب کا جا چکا، میں اب تک ہوں پڑا جلتا[1]
اس پھیلے بے انت بیاباں میں ہے ابھی اُمّید
تازہ دم اِک قافلے کی آ پہنچے کوئی نوید
میرے بدن میں جاں مہجوری سے ہے گریہ کناں
آہ، دریغا میں اور میری بے تاثیر فغاں!

❁❁❁

---

[1] اس شعر پر آتش کے اس شعر کا فیضان واضح ہے:

؎ نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہاں اقبال نے ''چوبِ نیم سوز'' اور ''سوزم ہنوز'' کہہ کر آتش کے مضمون کو مؤثر تر کر دیا ہے! (مترجم)

پس چه باید کرد

فارسی متن

فہرست

۱)	بخوانندۂ کتاب	۱۱۵
۲)	تمہید	۱۱۶
۳)	خطاب بہ مہرِ عالمتاب	۱۲۱
۴)	حکمتِ کلیمی	۱۲۴
۵)	حکمتِ فرعونی	۱۲۹
۶)	لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ	۱۳۲
۷)	فقر	۱۳۷
۸)	مردِ حُر	۱۴۷
۹)	دراسرارِ شریعت	۱۵۱
۱۰)	اشکے چند برافتراقِ ہندیاں	۱۵۸
۱۱)	سیاسیاتِ حاضرہ	۱۶۲
۱۲)	حرفے چند با اُمّتِ عربیہ	۱۶۸

۱۳) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ۱۷۴
۱۴) درحضور رسالت مآبؐ ۱۸۳

بخوانندۂ کتاب

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم
طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است
گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست
نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

❁❁❁

تمہید

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب
خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش
از نےِ آں نے نوازِ پاک زاد
باز شورے در نہادِ من فتاد
گفت جانہا محرمِ اسرار شد
خاور از خوابِ گراں بیدار شد
جذبہ ہائے تازہ او را دادہ اند
بندہائے کہنہ را بکشادہ اند

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ
کس نکو ننشست در نارِ فرنگ

باش مانندِ خلیل اللہ مست
ہر کہن بتخانہ را باید شکست

اُمّتاں را زندگی جذبِ دروں
کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد
بے جنونِ ذوفنوں کارے نکرد

مومن از عزم و توکّل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

خیر را او باز می داند ز شر
از نگاہش عالمے زیر و زبر

کوہسار از ضربتِ او ریز ریز
در گریبانش ہزاراں رستخیز

تا مے از میخانۂ من خوردہ ای
کہنگی را از تماشا بردہ ای

در چمن زی مثلِ بو مستور و فاش
درمیانِ رنگ، پاک از رنگ باش
عصرِ تو از رمزِ جاں آگاہ نیست
دینِ او جز حُبِّ غیرُ اللہ نیست
فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است
فکرِ او بر آب و گل پیچیدہ است
دیدہ از قندیلِ دل روشن نکرد
پس ندید الّا کبود و سرخ و زرد

اے خوش آں مردے کہ دل با کس نداد
بندِ غیر اللہ را از پا کشاد

سرِّ شیری را نہ فہمد گاو و میش
جز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش
با حریفِ سفلہ نتواں خورد مے
گرچہ باشد پادشاہِ روم و رے
یوسفِ ما را اگر گرگے برد
بہ کہ مردے ناکسے او را خرد

اہلِ دنیا بے تخیّل بے قیاس
بوریابافانِ اطلس ناشناس

اعجمی مردے چہ خوش شعرے سرود
سوزد از تاثیرِ او جاں در وجود

"نالۂ عاشق بگوشِ مردمِ دنیا
بانگِ مسلمانی و دیارِ فرنگ است"

معنیِ دین و سیاست باز گوے
اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوے

"غم خور و نانِ غم افزایاں مخور
زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر"

(رومی)

خرقہ خود بار است بر دوشِ فقیر
چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر

قلزمی؟ با دشت و در پیہم ستیز
شبنمی؟ خود را بہ گلبرگے بریز

سرِّ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست
روحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود
عقدۂ خود را بدستِ خود کشود
از خودی اندر ضمیرِ خود نشست
رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست
رخ سوئے دریائے بے پایاں نکرد
خویشتن را در صدف پنہاں نکرد
اندر آغوشِ سحر یک دم تپید
تا بکامِ غنچۂ نورس چکید

❁❁❁

خطاب بہ مہر عالمتاب

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر
می کنی ہر ذرّہ را روشن ضمیر
از تو ایں سوز و سرور اندر وجود
از تو ہر پوشیدہ را ذوقِ نمود
می رود روشن تر از دستِ کلیم
زورقِ زرّینِ تو در جوئے سیم
پرتوِ تو ماہ را مہتاب داد
لعل را اندر دلِ سنگ آب داد
لالہ را سوزِ دروں از فیضِ تست
در رگِ او موجِ خوں از فیضِ تست
نرگساں[1] صد پردہ را بر می درد
تا نصیبے از شعاعِ تو برد

---

[1] نرگساں: مزید علیہ نرگس

خوش بیا صبحِ مراد آوردہ ای
ہر شجر را نخلِ سینا کردہ ای

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز
در ضمیرِ من چراغے بر فروز

تیرہ خاکم را سراپا نور کن
در تجلّی ہائے خود مستور کن

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق
بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

از نوائے پختہ سازم خام را
گردشِ دیگر دہم ایّام را

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ
از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

زندگی از گرمیِ ذکر است و بس
حریّت از عفّتِ فکر است و بس

چوں شود اندیشۂ قومے خراب
ناسرہ[۱] گردد بدستش سیمِ ناب

---

[۱] ناسرہ: کھوٹی

میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم
در نگاہِ او کج آید مستقیم

بر کراں از حرب و ضربِ کائنات
چشمِ او اندر سکوں بیند حیات

موج از دریاش کم گردد بلند
گوہرِ او چوں خزف ناارجمند

پس نخستیں بایدش تطہیرِ[۱] فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

❀❀❀

[۱] تطہیر: پاک کرنا

حکمتِ کلیمی

تا نبوّت حکمِ حق جاری کند
پشتِ پا[۱] بر حکمِ سلطاں می زند
در نگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر
غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر
پختہ سازد صحبتش ہر خام را
تازہ غوغائے دہد ایّام را
درسِ او اللہ بس باقی ہوس
تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس
از نمِ او آتش اندر شاخِ تاک
در کفِ خاک از دمِ او جانِ پاک
معنیِ جبریل و قرآن است او
فِطرۃُ اللہ را نگہبان است او

---

[۱] پشتِ پازدن: ٹھکرا دینا

حکمتش برتر ز عقلِ ذوفنوں
از ضمیرش امّتے آید بروں
حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج
بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج
از نگاہش فرودیں خیزد ز دَے
دُردِ ہر خُم تلخ تر گردد ز مَے
اندر آہِ صبحگاہِ او حیات
تازہ از صبحِ نمودش کائنات
بحر و بر از زورِ طوفانش خراب
در نگاہِ او پیامِ انقلاب
درسِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ[1] می دہد
تا دلے در سینۂ آدم نہد
عزم و تسلیم و رضا آموزدش
در جہاں مثلِ چراغ افروزدش
من نمی دانم چہ افسوں می کند
روح را در تن دگرگوں می کند

---

[1] لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ: تلمیح بہ آیۂ قرآنی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ یعنی مومن خوف وغم سے پاک ہیں۔

صحبتِ او ہر خزف را دُر کند
حکمتِ او ہر تہی را پُر کند
بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز
ہر کہن معبود را کن ریز ریز
مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن
از دو حرف رَبّیَ الاَعلیٰ شکن
فقر خواہی از تہیدستی منال
عافیت در حال و نے در جاہ و مال
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد
نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد
بگذر از کاؤس و کے اے زندہ مرد
طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد
از مقامِ خویش دور افتادہ ای
کرگسی کم کن کہ شاہیں زادہ ای
مرغک اندر شاخسارِ بوستاں
بر مرادِ خویش بندد آشیاں
تو کہ داری فکرتِ گردوں مسیر
خویش را از مرغکے کمتر مگیر

دیگر ایں نُہ آسماں تعمیر کن
بر مرادِ خود جہاں تعمیر کن

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

چار سوئے با فضائے نیلگوں
از ضمیرِ پاکِ او آید بروں

در رضائے حق فنا شو چوں سلف
گوہرِ خود را بروں آر از صدف

در ظلامِ ایں جہانِ سنگ و خشت
چشمِ خود روشن کن از نورِ سرشت

تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب
ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

ابتدائے عشق و مستی قاہری است
انتہائے عشق و مستی دلبری است

مردِ مومن از کمالاتِ وجود
او وجود و غیرِ او ہر شے نمود

گر بگیرد سوز و تاب از لَا الٰہ
جز بکامِ او نہ گردد مہر و مہ

❁❁❁

حکمتِ فرعونی

حکمتِ اربابِ دیں کردم عیاں
حکمتِ اربابِ کیں را ہم بداں
حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن
مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن!
حکمتے از بندِ دیں آزادۂ
از مقامِ شوق دور افتادۂ
مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام
تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام!
شیخِ ملّت با حدیثِ دلنشیں
بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں
از دمِ او وحدتِ قومے دو نیم
کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر
کارِ او تخریبِ خود، تعمیرِ غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر
از وجودِ خود نگردد باخبر!
نقشِ حق را از نگینِ خود سِتُرد
در ضمیرش آرزوہا زاد و مُرد
بے نصیب آمد ز اولادِ غیور
جاں بہ تن چو مردۂ در خاکِ گور
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن
نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
در دلِ شاں آرزوہا بے ثبات
مردہ زایند از بطونِ[1] اُمّہات[2]
دخترانِ او بزلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
ساختہ، پرداختہ، دل باختہ
ابرواں مثلِ دو تیغِ آختہ

---

[1] بطون: جمع بطن، پیٹ

[2] اُمہات: جمع اُمّ، مادر

ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر
سینۂ ماہی بموج اندر نگر
ملّتے خاکسترِ او بے شرر
صبحِ او از شامِ او تاریک تر
ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ
کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ
منعمانِ او بخیل و عیش دوست
غافل از مغزاند و اندر بندِ پوست
قوّتِ فرمانروا معبودِ او
در زیانِ دین و ایماں سُودِ او
از حدِ امروزِ خود بیروں نجست
روزگارش نقشِ یک فردا نہ بست
از نیاگاں دفترے اندر بغل
الاماں از گفتہ ہائے بے عمل!
دینِ او عہدِ وفا بستن بغیر
یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مُرد و مرگِ خویش را نشناختہ

لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

نکتۂ می گویم از مردانِ حال
امّتاں را لَا جلال اِلَّا جمال
لَا و اِلّا احتسابِ کائنات
لَا و اِلّا فتح بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں
حرکت از لَا زاید از اِلّا سکوں
تا نہ رمزِ لَا اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست
ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
ملّتے کز سوزِ او یک دم تپید
از گلِ خود خویش را باز آفرید

پیشِ غیرُ اللہ لا گفتن حیات
تازہ از ہنگامۂ او کائنات
از جنونش ہر گریباں چاک نیست
در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست
جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد
می کند صد رہ نشیں را رہ نورد
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر
لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے
ایں غَوِ رَعد[1] است نے آوازِ نے
ضربِ او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود
با تو می گویم ز ایّامِ عرب
تا بدانی پختہ و خامِ عرب

---

[1] غوِ رعد: بجلی کی کڑک

ریز ریز از ضربِ او لات و منات
در جہات آزاد از بندِ جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او
گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زور طوفانش بدرد
عالمے در آتشِ او مثلِ خس
ایں ہمہ ہنگامۂ لَا بود و بس
اندریں دیرِ کہن پیہم تپید
تا جہانے تازۂ آمد پدید
بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست
ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست
اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند
از کنارِ جوے او آوردہ اند
لوحِ دل از نقشِ غیرُ اللہ شُست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رُست

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرفِ لَا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زدست
تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لَا سلاطیں، لَا کلیسا، لَا اِلٰہ
فکرِ او در تندبادِ لَا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لَا نیاساید حیات
سوے اِلّا می خرامد کائنات
لَا و اِلّا ساز و برگِ امّتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ اُمّتاں

در محبت پختہ کے گردد خلیل
تا نگردد لَا سوئے اِلّا دلیل[1]
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لَا پیش نمرودے بزن
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جَو
از جلالِ لَا اِلٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لَاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

❀❀❀

---

[1] دلیل: راہ نما

فقر

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل
یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل

فقر کارِ خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لَا اِلٰہ پیچیدن است

فقر خیبرگیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰؐ است

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند
بر نوامیسِ[1] جہاں شبخوں زند

بر مقامِ دیگر اندازد ترا
از زجاج الماس می سازد ترا

---

[1] نوامیس: جمع ناموس، مراد قدرت کی پوشیدہ قوتوں سے ہے

برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم
مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم
گرچہ اندر بزم کم گوید سخن
یک دمِ او گرمیِ صد انجمن
بے پراں را ذوقِ پروازے دہد
پشہ را تمکینِ شہبازے دہد
با سلاطیں درفتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر
از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر
وارہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بآں صحرا مقام
کاندرو شاہیں گریزد از حمام
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرۂ او لَا ملوک
آتشِ ما سوزناک از خاکِ او
شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ او

بر نیفتد ملّتے اندر نبرد
تا درو باقیست یک درویش مرد
آبروئے ما ز استغنائے اوست
سوزِ ما از شوق بے پروائے اوست
خویشتن را اندر ایں آئینہ بیں
تا ترا بخشند سلطانِ مبیں
حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر
مومناں را گفت آں سلطانِ دیںؐ
'مسجدِ من ایں[1] ہمہ روئے زمیں'
الاماں از گردشِ نُہ آسماں
مسجدِ مومن بدستِ دیگراں
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش
اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو
ترکِ ایں دیرِ کہن تسخیرِ او

---

[1] مسجدِ من ایں الخ: تلمیح ہے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس مشہور حدیث کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔

راکبش بودن ازو وارستن است
از مقامِ آب و گل برجستن است
صیدِ مومن ایں جہانِ آب و گل
باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل؟
حل نشد ایں معنیِ مشکل مرا
شاہیں از افلاک بگریزد چرا
واے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد
مرغکے از چنگِ او نامد بدرد
درکنامے[1] ماند زار و سرنگوں
پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں
فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است!

---

[1] کنام: باز کے رہنے کی جگہ

زندگی آں را سکونِ غار و کوہ
زندگی ایں را ز مرگِ باشکوہ!
آں خدا را جستن از ترکِ بدن
ایں خودی را بر فسانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و واسوختن
ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر
از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ
فقر را تا ذوقِ عریانی نماند
آں جلال اندر مسلمانی نماند
وائے ما اے وائے ایں دیرِ کہن
تیغِ لَا در کف نہ تو داری، نہ من
دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں
ایں جہانِ کہنہ درباز اے جواں

تا کجا بےغیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں مردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را
جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند
آہ زاں قومے کہ از پا برفتاد
میر و سلطاں زاد و درویشے نزاد
داستانِ او مپرس از من کہ من
چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ
ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ
مسلمِ ایں کشور از خود ناامید
عمرہا شد با خدا مردے ندید
لا جرم از قوتِ دیں بدظن است
کاروانِ خویش را خود رہزن است

از سہ قرن[۱] ایں اُمّتِ خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرورِ اندروں
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملّائے او محرومِ شوق
زشتیِ اندیشہ او را خوار کرد
افتراق[۲] او را ز خود بیزار کرد
تا نداند از مقام و منزلش
مُرد ذوقِ انقلاب اندر دلش
طبعِ او بے صحبتِ مردِ خبیر
خستہ و افسردہ و حق نا پذیر
بندۂ رد کردۂ مولاست او
مفلس و قلاش و بے پرواست او
نے بکف مالے کہ سلطانے برد
نے بدل نورے کہ شیطانے برد
شیخِ او لُردِ[۳] فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید

---

[۱] قرن: صدی
[۲] افتراق: پراگندگی
[۳] لُرد: انگریزی لفظ لارڈ کا مُفرّس

گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد!
عصرِ ما ما را ز ما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد
سوزِ او تا از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
باطنِ ایں عصر را نشناختی
داوِ اوّل[1] خویش را در باختی
تا دماغِ تو بہ پیچاکش فتاد
آرزوئے زندۂ در دل نزاد
احتسابِ خویش کن از خود مرو
یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو

---

[1] داوِ اوّل: یعنی تو نے اپنے آپ کو پہلے ہی داؤ میں ہار دیا

تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس
اندر ایں کشور مقامِ خود شناس
ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند
بر نگوں شاخ آشیانِ خود مبند
نغمہ داری در گلو اے بے خبر
جنسِ خود بشناس و با زاغاں مپر
خویشتن را تیزیِ شمشیر دہ
باز خود را در کفِ تقدیر دہ
اندرونِ تست سیل بے پناہ
پیشِ او کوہِ گراں مانندِ کاہ
سیل را تمکیں ز نا آسودن است
یک نفس آسودنش نابودن است
من نہ ملّا، نے فقیہہِ نکتہ ور
نے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہِ دیں تیز بیں و سست گام
پختۂ من خام و کارم ناتمام

تا دلِ پر اضطرابم دادہ اند
یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند

’از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر‘

مردِ حُر

مردِ حُر محکم ز وردِ لَا تَخَفْ[1]
ما بمیداں سر بجیب، او سر بکف
مردِ حُر از لَا اِلٰہ روشن ضمیر
می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد
مردِ حُر بارے برد خارے خورد
پائے خود را آنچناں محکم نہد
نبضِ رہ از سوزِ او بر می جہد
جانِ او پایندہ تر گردد ز موت
بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت
ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج
گیرد آں درویش از سلطاں خراج

---

[1] لَا تَخَفْ: تلمیح آیۂ قرآنی کی طرف یعنی خوف نہ کر

گرمیِ طبعِ تو از صہبائے اوست
جوئے تو پروردۂ دریائے اوست
پادشاہاں در قباہائے حریر
زرد رو از سہمِ آں عُریاں فقیر
سرِّ دیں ما را خبر، او را نظر
او درونِ خانہ، ما بیرونِ در
ما کلیسا دوست! ما مسجد فروش!
او ز دستِ مصطفیٰؐ پیمانہ نوش
نے مغاں را بندہ، نے ساغر بدست
ما تہی پیمانہ او مستِ الست
چہرۂ گل از نمِ او احمر است
ز آتشِ ما دودِ او روشن تر است!
دارد اندر سینہ تکبیرِ اُمم
در جبینِ اوست تقدیرِ اُمم
قبلۂ ما گہ کلیسا، گاہ دیر
او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدۂ
او نہ گنجد در جہانِ رنگ و بو
صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ
آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ!
در جہانِ بے ثبات او را ثبات
مرگ او را از مقاماتِ حیات!
اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل
گِل ز فیضِ صحبتش دارائے دل
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن
او ہمہ کردار و کم گوید سخن
ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست
فقرِ او از لَا اِلٰہ تیغے بدست
ما پرِ کاہے اسیرِ گردباد
ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد
محرمِ او شو ز ما بیگانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

شکوہ کم کن از سپہرِ گرد گرد
زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد
صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است
مردِ حُر دریائے ژرف و بیکراں
آب گیر از بحر و نے از ناوداں
سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ
پیشِ او کوہِ گراں یک تودہ ریگ!
روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن
ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن
روزِ کیں آں محرمِ تقدیرِ خویش
گورِ خود می کندد از شمشیر خویش
اے سرت گردم گریز از ما چو تیر
دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر
می نہ روید تخمِ دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندانِ دل

اندر ایں عالم نیرزی با خسے
تا نیاویزی بدامانِ کسے!

دراسرارِ شریعت

نکتہ ہا از پیرِ روم آموختم
خویش را در حرف او واسوختم
مال را گر بہرِ دیں باشی حمول
نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ[۱] گوید رسولؐ
(رومی)
گر نداری اندر ایں حکمت نظر
تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر
از تہی دستاں کشادِ امّتاں
از چنیں منعم فسادِ اُمّتاں
جدّت اندر چشمِ او خوار است و بس
کہنگی را او خریدار است و بس

---

[۱] نعم مالٌ صالحٌ: حدیثِ نبوی، مطلب یہ ہے کہ اگر مال و دولت دینی امور پر خرچ کرنے کے لیے جمع کیا جائے تو وہ مالِ صالح ہے۔

در نگاہش ناصواب آمد صواب
ترسد از ہنگامہ ہائے انقلاب
خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد
آبروئے دخترِ مزدور برد
در حضورش بندہ می نالد چو نے
بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے
نے بجامش بادہ و نے در سبوست
کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

تا ندانی نکتۂ اکلِ حلال
بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشمِ او یَنْظر بِنُورِ اللہ[1] نیست

---

[1] ینظر بنور اللہ: تلمیح ہے حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

او نداند از حلال و از حرام
حکمتش خام است و کارش ناتمام
امتّے بر اُمّتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک[1] ایں فکرِ چالاک یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوبِ کار چیست
جادۂ ہموار و ناہموار چیست

---

[1] بنوک: بنک کی جمع، عربوں نے اس انگریزی لفظ کو معرّب کرلیا ہے۔

شرع بر خیزد ز اعماقِ[1] حیات
روشن از نورش ظلامِ کائنات
گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام
نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر
با نگاہے دیگرے او را نگر
حکمش از عدل است وتسلیم و رضاست
بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰؐ است
از فراق است آرزوہا سینہ تاب
تو نمانی چوں شود 'او' بے حجاب
از جدائی گرچہ جاں آید بلب
وصلِ 'او' کم جو، رضائے 'او' طلب
مصطفیٰؐ داد از رضائے 'او' خبر
نیست در احکامِ دیں چیزے دگر
تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریا است
فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست

---

[1] اعماق: جمعِ عمق، گہرائی

حکمِ سلطاں گیر و از حکمش منال
روزِ میداں نیست روزِ قیل و قال
تا توانی گردن از حکمش مپیچ
تا نہ پیچد گردن از حکمِ تو ہیچ
از شریعت اَحْسَنُ التَّقْوِیْم[1] شو
وارثِ ایمانِ ابراہیم شو
پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات
فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں
جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی، دینِ تو مجبوری است
ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است
بندہ تا حق را نہ بیند آشکار
بر نمی آید ز جبر و اختیار

---

[1] احسن التقویم: تلمیح ہے آیۂ قرآنی کی طرف جس کا مطلب یہ ہے کہ وجود انسانی کی ساخت نہایت احسن طریق پر ہوئی ہے۔

تو یکے در فطرتِ خود غوطہ زن
مردِ حق شو بر ظن و تخمیں متن
تا بہ بینی زشت و خوبِ کار چیست
اندر ایں نُہ پردۂ اسرار چیست
ہر کہ از سرِّ نبی گیرد نصیب
ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب
اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم
تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس
مکتب و ملّا سخن ہا ساختند
مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مُرد
آتشِ او در ضمیرِ او فسُرد

صوفیانِ با صفا را دیدہ ام
شیخِ مکتب را نکو سنجیدہ ام

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید

ہر یکے دانائے قرآن و خبر
در شریعت کم سواد و کم نظر

عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس
منبرِ شاں منبرِ کاک[1] است و بس

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود
آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود؟

کارِ اقوام و ملل ناید درست
از عمل بنما کہ حق در دستِ تست

❀❀❀

[1] منبرِ کاک: کاک ایک قسم کی چھوٹی سی روٹی ہے۔ منبرِ کاک اُس چوبی میز کو کہتے ہیں جس پر نان بائی روٹی رکھ کر بیچتا ہے۔

اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں

اے ہمالہ! اے اطک! اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
زندگانی بر مرادِ دیگراں
جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں
نیست ایں مرگے کہ آید ز آسماں
تخمِ او می بالد از اعماقِ جاں
صیدِ او نے مردہ شو[1] خواہد نہ گور
نے ہجوم دوستاں از نزد و دور

---

[1] مردہ شو: غسل دینے والا

جامۂ کس در غمِ او چاک نیست
دوزخِ او آں سوئے افلاک نیست
در ہجومِ روزِ حشر او را مجو
ہست در امروزِ او فردائے او
ہر کہ ایں جا دانہ کشت، ایں جا درود
پیشِ حق آں بندہ را بردن چہ سود
اُمتّے کز آرزو نیشے نہ خورد
نقشِ او را فطرت از گیتی سترد
اعتبارِ تخت و تاج از ساحری است
سخت چوں سنگ ایں زجاج از ساحری است
در گذشت از حکم ایں سحرِ مبیں
کافری از کفر و دینداری ز دیں
ہندیاں با یک دگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں

کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!

اے ترا ہر لحظہ فکرِ آب و گل
از حضورِ حق طلب یک زندہ دل
آشیانش گرچہ در آب و گل است
نُہ فلک سر گشتۂ ایں یک دل است
تا نہ پنداری کہ از خاک است او
از بلندی ہائے افلاک است او
ایں جہاں او را حریم کوئے دوست
از قبائے لالہ گیرد بوئے دوست
ہر نفس با روزگار اندر ستیز
سنگِ رہ از ضربتِ او ریز ریز
آشنائے منبر و دار است او
آتشِ خود را نگہدار است او
آبجوے و بحر ہا دارد ببر
می دہد موجش ز طوفانے خبر

زندہ و پایندہ بے نانِ تنور
میرد آں ساعت کہ گردد بے حضور
چوں چراغ اندر شبستانِ بدن
روشن از وے خلوت و ہم انجمن
ایں چنیں دل خود نگر، اللہ مست
جز بہ درویشی نمی آید بدست
اے جواں دامانِ او محکم بگیر
در غلامی زادہ ای آزاد میر

❀❀❀

سیاساتِ حاضرہ

می کند بندِ غلاماں سخت تر
حُرّیت می خواند او را بے بصر
گرمیِ ہنگامۂ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید
سلطنت را جامعِ اقوام گفت
کارِ خود را پختہ کرد و خام گفت
در فضایش بال و پر نتواں کشود
با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغِ قفس "اے دردمند
آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مَرغ
او نباشد ایمن از شاہین و چرغ"

از فسونش مرغِ زیرک دانہ مست
نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست

حرّیت خواہی بہ پیچاکش میفت
تشنہ میر و بر نمِ تاکش میفت

الحذر از گرمیِ گفتارِ او
الحذر از حرفِ پہلودارِ[۱] او

چشم ہا از سرمہ اش بے نور تر
بندۂ مجبور ازو مجبور تر

از شرابِ ساتگینش[۲] الحذر
از قمارِ بدنشینش الحذر

از خودی غافل نہ گردد مردِ حُر
حفظِ خود کن حَبِّ افیونش مخور

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تا کند ضربِ تو دریا را دونیم

---

۱ پہلودار: ایسی بات جس کے کئی معانی نکل سکتے ہوں
۲ ساتگیں: پیالہ

داغم از رسوائی ایں کارواں
در امیرِ او ندیدم نورِ جاں
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لَا الٰہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید!
پردۂ ناموسِ ما را بردرید
دامنِ او را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است
اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد
صیدِ آہو با سگِ کورے نکرد
آہ از قومے کہ چشم از خویش بست
دل بہ غیر اللہ داد، از خود گسست
تا خودی در سینۂ ملّت بمرد
کوہ کاہی کرد و باد او را ببرد
گرچہ دارد لَا اِلٰہ اندر نہاد
از بطونِ او مسلمانے نزاد
آنکہ بخشد بے یقیناں را یقیں
آنکہ لرزد از سجود او زمیں

آنکہ زیرِ تیغ گوید لَا اِلٰہ
آنکہ از خونش بروید لَا اِلٰہ
آں سرُور آں سوزِ مشتاقی نماند
در حرم صاحبدلے باقی نماند
اے مسلماں اندریں دیرِ کہن
تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن
جہدِ با توفیق و لذّت درطلب
کس نیاید بے نیازِ نیم شب
زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس
گرچہ دانا حالِ دل با کس نگفت
از تو دردِ خویش نتوانم نہفت
تا غلامم در غلامی زادہ ام
ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفیٰؐ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود

عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر
سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او"

از قیامِ بے حضورِ من مپرس
از سجودِ بے سرورِ من مپرس
جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس
قسمتِ مردانِ آزاد است و بس
مردے آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرم رو چرخِ کبود
ما غلاماں از جلالش بے خبر
از جمالِ لازوالش بے خبر
از غلامے لذّتِ ایماں مجو
گرچہ باشد حافظِ قرآں، مجو
مومن است و پیشۂ او آزری است
دین و عرفانش سراپا کافری است

در بدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں[۱] در صلوٰت
ور نداری خونِ گرم اندر بدن
سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن
عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں!

❀❀❀

[۱] ہست معراج مسلماں الخ: تلمیح حدیثِ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز معراج ہے مردِ مومن کے لیے۔

حرفے چند با اُمّتِ عربیہ

اے در و دشتِ تو باقی تا ابد
نعرۂ لَا قَیصَر و کسرا ے[1] کہ زد؟
در جہانِ نزد و دور و دیر و زود
اولیں خوانندۂ قرآں کہ بود؟
رمزِ الاَّ اللہ کرا آموختند؟
ایں چراغ اوّل کجا افروختند؟
علم و حکمت ریزۂ از خوانِ کیست؟
آیۂ فَاَصْبَحْتُم[2] اندر شانِ کیست؟
از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب
لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

---

[1] لا قَیْصَرَ و کسرٰی: تلمیح ہے مشہور حدیث کی طرف هلك قيصر فلا قيصر بعده الخ

[2] فَاَصْبَحْتُم: تلمیح ہے آیۂ قرآنی کی طرف فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ج ۔

حُرّیت پروردۂ آغوشِ اوست
یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست
او دلے در پیکرِ آدم نہاد
او نقاب از طلعتِ آدم کشاد
ہر خداوندِ کہن را او شکست
ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست
گرمیِ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ
سطوتِ بانگِ صلوٰت اندر نبرد
قرأت الصّٰفّٰت[1] اندر نبرد
تیغِ ایّوبی[2] نگاہِ بایزید[3]
گنجہائے ہر دو عالم را کلید
عقل و دل را مستی از یک جامِ مے
اختلاطِ ذکر و فکرِ روم و رے[4]

---

[1] الصّٰفّٰت: سورۂ قرآن کا نام ہے۔
[2] ایوبی: سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ۔
[3] بایزید: حضرتِ بایزید بسطامی مشاہیر اولیائے اُمت سے ہیں۔
[4] روم و رے یعنی حضرت جلال الدین رومی اور امام فخر الدین رازی۔

علم و حکمت، شرع و دیں، نظمِ امور
اندرونِ سینہ دل ہا ناصبور
حسنِ عالم سوزِ الحمرا و تاج
آنکہ از قدّوسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست
یک تجلّی از تجلّیاتِ اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز
باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

'حمد بیحد مر رسولِ پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را'

(خواجہ عطار بہ تغیر لفظی)

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد
سارباں را راکبِ تقدیر کرد
بانگِ تکبیر و صلوٰت و حرب و ضرب
اندراں غوغا کشادِ شرق و غرب

اے خوش آں مجذوبی و دل بردگی
آہ زیں دل گیری و افسردگی

کارِ خود را اُمّتاں بردند پیش
تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش

امّتے بودی، امم گردیدہ ای
بزمِ خود را خود ز ہم پاشیدہ ای[1]

ہر کہ از بندِ خودی وارَست، مُرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد

آنچہ تو با خویش کردی، کس نکرد
روحِ پاکِ مصطفیٰؐ آمد بدرد!

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر

از فریبِ او اگر خواہی اماں
اشترانش را ز حوضِ خود براں

حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد

---

[1] از ہم پاشیدن: پراگندہ کرنا

تا عرب در حلقۂ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد
عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر
در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ
قوت از جمعیتِ دینِ مبیں
دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں
تا ضمیرش رازدانِ فطرت است
مردِ صحرا پاسبانِ فطرت است
سادہ و طبعش عیارِ زشت و خوب
از طلوعش صد ہزار انجم غروب
بگذر از دشت و در و کوہ و دمن
خیمہ را اندر وجودِ خویش زن
طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز
ناقہ را سر دہ بمیدانِ ستیز
عصرِ حاضر زادۂ ایّام تست
مستیِ او از مئے گلفامِ تست

شارحِ اسرارِ او تو بودہ ای
اوّلیں معمارِ او تو بودہ ای
تا بہ فرزندی گرفت او را فرنگ
شاہدے گردید بے ناموس و ننگ
گرچہ شیرین است و نوشین است او
کج خرام و شوخ و بے دین است او
مردِ صحرا! پختہ تر کن خام را
بر عیارِ خود بزن ایّام را

❁❁❁

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

آدمیّت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟
باز روشن می شود ایّامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسمِ لادینی[1] نہاد
گرگے اندر پوستینِ برۂ
ہر زماں اندر کمینِ برۂ
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازو است
آدمیّت را غمِ پنہاں ازو است

---

[1] رسم لادینی: یعنی نظامِ اُمورِ ریاست میں دین سے بے تعلق ہو جانا

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

ہر چه می بینی ز انوارِ حق است
حکمتِ اشیا ز اسرارِ حق است
ہر که آیاتِ خدا بیند حُر است
اصلِ ایں حکمت ز حُکمِ اُنظُر[۱] است
بندۂ مومن ازو بہروز تر
ہم به حالِ دیگراں دل سوز تر
علم چوں روشن کند آب و گلش
از خدا ترسنده تر گردد دلش
علم اشیا خاکِ ما را کیمیاست
آه! در افرنگ تاثیرش جداست
عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت
چشمِ او بے نم، دلِ او سنگ و خشت

[۱] حکم انظر: تلمیح ہے آیۂ قرآنی کی طرف فَانْظُر [اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ] اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ یعنی نظامِ فطرت کا بغور مطالعہ کرو۔

علم ازو رسواست اندر شہر و دشت
جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاک نوعِ انساں سخت کوش
با خساں اندر جہانِ خیر و شر
در نسازد مستیِ علم و ہنر
آہ از افرنگ و از آئینِ او
آہ از اندیشۂ لا دینِ او
علمِ حق را ساحری آموختند
ساحری نے، کافری آموختند!
ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر[1]
تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر
اے کہ جاں را باز می دانی ز تن
سحرِ ایں تہذیبِ لا دینے شکن
روح شرق اندر تنش باید دمید
تا بگردد قفلِ معنی را کلید

---

[1] نفیر آوردن: ہجوم کرنا

عقل اندر حکمِ دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

زندگانی ہر زماں در کش مکش
عبرت آموز است احوالِ حبش
شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال
برّہ را کرد است بر گرگاں حلال
نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد
از کفن دزداں، چہ امیدِ کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن
صیدِ تو ایں میش و آں نخچیرِ من!

نکتہ ہا کو می نہ گنجد در سخن
یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن!

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو
مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست
آبروئے خاوراں در دستِ تست

ایں کہن اقوام را شیرازہ بند
رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اہل حق را زندگی از قوت است
قوتِ ہر ملّت از جمعیت است
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں
سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم
شیوۂ آدم گری آموختیم
ہم ہنر ہم دیں ز خاکِ خاور است
رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است
وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب
آفتاب از ما و ما از آفتاب
ہر صدف را گوہر از نیسانِ ماست
شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست

روحِ خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم
خونِ آدم در رگِ گل دیدہ ایم

فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود
زد نخستیں زخمہ بر تارِ وجود

داشتیم اندر میانِ سینہ داغ
بر سرِ راہے نہادیم ایں چراغ

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں
آں یدِ بیضا برآر از آستیں

خیز و از کارِ اُمم بکشا گرہ
نشۂ افرنگ را از سر بنہ

نقشے از جمعیتِ خاور فگن
واستاں خود را ز دستِ اہرمن

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زُنّارِ فرنگ

زخم ازو، نشتر ازو، سوزن ازو
ما و جوئے خون و امیدِ رفو

خود بدانی بادشاہی قاہری است
قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دکّاں شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گر تو میدانی حسابش را درست
از حریرش نرم تر کرپاسِ تست
بے نیاز از کارگاہِ او گذر
در زمستاں پوستینِ او مخر
کشتنِ بے حرب وضرب آئینِ اوست
مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست
بوریائے خود بہ قالینش مدہ
بیذقِ[۱] خود را بہ فرزینش[۲] مدہ
گوہرش تف دار[۳] ودر لعلش رگ است
مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است

[۱،۲] بیذق، فرزین: پیادہ، وزیر (اصطلاحاتِ شطرنج)
[۳] تف دار: عیب دار

رہزنِ چشمِ تو خوابِ مخملش
رہزنِ تو رنگ و آبِ مخملش
صد گرہ افگندہ ای در کارِ خویش
از قماشِ او مکن دستارِ خویش
ہوشمندے از خمِ او مے نخورد
ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقتِ سودا خندخند و کم خروش
ما چو طفلانیم و او شکّر فروش
محرم از قلب و نگاہِ مشتری است
یا رب ایں سحر است یا سوداگری است
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود
ما خریداراں ہمہ کور و کبود
آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکوبیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر
چرب دستیہائے[۱] یورپ را نگر
قالی[۲] از ابریشمِ تو ساختند
باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسوں خورد
رنگ و آبِ او ترا از جا برد
وائے آں دریا کہ موجش کم تپید
گوہرِ خود را ز غوّاصاں خرید!

❁❁❁

---

[۱] چرب دستی: کاریگری
[۲] قالی: قالین

در حضور رسالت مآبؐ

شبِ سہ اپریل ۱۹۳۶ء کہ در دار الاقبال بھوپال بودم سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ را در خواب دیدم فرمودند کہ از علالتِ خویش در حضور رسالت مآبؐ عرض کن

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ
وا رہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح، تو بانگِ اذاں
لذّتِ سوز و سرور از لا الٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خدا ہا ساختیم از گاو خر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر

نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست
ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو
سازِ ما بے صوت گردید آنچناں
زخمہ بر رگہائے او آید گراں
در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰؐ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر
آرزو در سینۂ او زود میر

ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حُرّیت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود
از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
ایں ز خود بیگانہ، ایں مستِ فرنگ
نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ
ناں خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک
داد ما را نالہ ہائے سوز ناک
دانہ چیں مانندِ مرغانِ سرا ست
از فضائے نیلگوں ناآشناست
آتشِ افرنگیاں بگداختش
یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر
از مقامِ او نداد او را خبر
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست
در دلش لَا غَالب اِلّا اللہ[۱] نیست!

[۱] لا غالب الا اللہ: یعنی اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں۔

تا دلِ او درمیانِ سینہ مرد
می نیندیشد مگر از خواب و خورد
بہرِ یک ناں نشترِ لَا و نعم
منتِ صد کس برائے یک شکم
از فرنگی می خرد لات و منات
مومن و اندیشۂ او سومنات
قُم بِاِذْنی[1] گوے و او را زندہ کن
در دلش اَللّٰہ ھُو را زندہ کن
ما ہمہ افسونیِ تہذیبِ غرب
کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست
وانما یک بندۂ اللّٰہ مست
"تا مسلماں باز بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را"
شہسوارا! یک نفس در کش عناں
حرفِ من آساں نیاید بر زباں

---

[1] قم باذنی: یعنی اُٹھ میرے حکم سے۔

آرزو آید کہ ناید تا بہ لب؟
می نہ گردد شوق محکومِ ادب
آں بگوید لب کشا اے دردمند
ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند
گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوئے زار و زبون و ناتواں
کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں
اے پناہِ من حریمِ کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو
آں نوا در سینہ پروردن کجا
وز دمے صد غنچہ وا کردن کجا
نغمۂ من در گلوئے من شکست
شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند
نالۂ کو می نہ گنجد در ضمیر
تا کجا در سینہ ام ماند اسیر
یک فضائے بے کراں می بایدش
وسعتِ نُہ آسماں می بایدش

آہ زاں دردے کہ در جان وتن است
گوشۂ چشم تو داروئے من است
در نسازد با دواہا جانِ زار
تلخ و بویش بر مشامم ناگوار
کارِ ایں بیمار نتواں برد پیش
من چو طفلاں نالم از داروئے خویش
تلخیِ او را فریبم از شکر
خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر
چوں بصیری[1] از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود

---

[1] بصیریؒ: مشہور عربی قصیدۂ بُردہ کا مصنف، یہ قصیدہ حضور رسالت مآب ﷺ کی نعت میں ہے۔ روایت ہے کہ بصیریؒ کا قصیدہ بارگاہِ نبوی ﷺ میں مقبول ہوا اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی۔

مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہرِ مادر است
با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز
اے وجودِ تو جہاں را نو بہار
پرتوِ خود را دریغ از من مدار
'خود بدانی قدرِ تن از جاں بود
قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود'
(رومی)

تا ز غیر اللہ ندارم ہیچ امید
یا مرا شمشیر گرداں یا کلید
فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چُست
تخمِ کرداری ز خاکِ من نہ رُست
تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من
محنتے دارم فزوں از کوہکن
مومنم، از خویشتن کافر نیم
بر فسانم زن کہ بدگوہر نیم

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است
چیزکے دارم کہ نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں
کز سُمِ شبدیزِ تو دارد نشاں!
بندۂ را کو نخواہد ساز و برگ
زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ!
اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب
بندۂ خود را حضورِ خود طلب
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر
دوستانش از غمِ او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چوں نے
تفتہ جاں از نغمہ ہاے پے بہ پے
در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز
کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز!
اندریں دشت و درے پہناورے
بو کہ آید کاروانے دیگرے
جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من! اے وائے من

❁❁❁